جہانِ غالب
23
Ga

غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:12　　شمارہ۔23

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:12 شمارہ:23 دسمبر 2016 تا مئی 2017ء

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

ISSN -2349-0225

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شیروانی آرٹ پرنٹرس 1480 گلی حکیم اجمل خاں، بلیماران، دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا تیئسواں شمارہ پیش خدمت ہے اردو کے لکھنے اور پڑھنے والوں کا غالب سے تعلق فطری ہے۔ شعرا، ادبا، ناقدین، محققین، طلبا اور اساتذہ کا تعلق تو سب پر عیاں ہے دوسری اصناف سے متعلقین کا بھی غالب سے رشتہ ہے چاہے وہ مورخ ہوں یا صحافی ہوں۔

اردو کے مشہور و معروف صحافی جناب جی ڈی چندن صاحب کے انتقال کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا ہے۔ چندن صاحب غالب اکیڈمی کے پڑوسی تھے۔ غالب اکیڈمی سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ اس کے سبھی پروگراموں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ شاید غالب اکیڈمی سے وابستگی کی وجہ سے انھوں نے عہد غالب کی صحافت پر تحقیق کا کام کیا اور غالب کے زمانے کا اردو کا سب سے پہلا اخبار جام جہاں نما کو انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ثابت کیا کہ 1822 میں کلکتہ سے نکلنے والا جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار تھا۔ چندن صاحب کے بیٹے جناب انل کمار لکھینا ریٹائرڈ آئی اے ایس کے تعاون سے غالب اکیڈمی نے اردو صحافت کا سفر اور جی ڈی چندن کی صحافتی خدمات کے عنوان سے 9/ اکتوبر 2016 کو ایک کل ہند سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں کچھ پرچے جی ڈی چندن کی سوانح اور خدمات سے متعلق پڑھے گئے تو کچھ پرچے اردو صحافت کے ارتقا اور فن سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ مقالے جہان غالب کے قارئین کے لیے

اس شمارے میں شامل کئے جارہے ہیں۔ جناب نند کشور وکرم اور جناب ریاض قدوائی کے مضامین چندن صاحب کی سوانح اور خدمات سے متعلق ہیں جناب ندیم صدیقی کا ممبئی میں اردو صحافت کا سفر اور صحافی کے عنوان سے پرچہ شامل ہے۔ جناب انجم عثمانی کا پرچہ اردو ٹیلی ویژن سے تعلق رکھتا ہے جناب سہیل انجم کا مقالہ اردو صحافت کی معدوم ہوتی صنف فیچر نگاری کے بارے میں ہے اور محترمہ فرحت رضوی نے اردو صحافت کے سفر میں خواتین کا پہلا قدم کے عنوان سے مقالہ تحریر کیا۔ ان پرچوں میں معلومات کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن پر اردو والوں کو ناز ہے۔ جیسے ہندوستان کی جنگ آزادی کی بنیاد اردو صحافت نے ڈالی یا 1857 اور اس کے بعد اردو صحافت ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بہت آگے تھی۔

شروع میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا مضمون غالب اور عہد غالب کا تخلیقی ماحول شامل اشاعت ہے۔ غالب اکیڈمی نے غالب کے غیر متداول کلام کتابی صورت میں شائع کیا ہے جسے جناب جمال عبدالواجد صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس پر انھوں نے ایک مضمون بھی لکھا ہے۔ وہ مضمون شامل اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ جناب شاہ نواز فیاض کا ایک مضمون پروفیسر گیان چند جین کی کتاب تفسیر غالب پر بھی شامل ہے۔ ایک مضمون استاد ذوق کی زبان پر ہے۔ آخر میں کتابوں کی باتیں پروفیسر صادق کی مرتب کی ہوئی کتاب چراغ دیر مع پانچ تراجم پر ڈاکٹر ظفر محمود کا تبصرہ شائع کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ جہان غالب کی یہ رنگارنگی پسند آئے گی۔

شمیم حنفی

غالب اور عہد غالب کا تخلیقی ماحول

ادب اور آرٹ کی طرح کلچر بھی سوچ سوچ کر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ غالبؔ اور ان کے عہد کی فکر، خاص طور پر ادبی فکر کے رابطوں کو سمجھنے کے لیے کلچر، آرٹ اور ادب کی خودمختاری کے تصور اور ایک غیر معمولی شخصیت کے انفرادی رویوں کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔

غالب اپنے مزاج اور اپنی ذہنی ساخت کے لحاظ سے Non-confirmist تھے۔ اپنی اس وضع پر وہ زندگی بھر قائم رہے اور بڑے سے بڑے بیرونی اثر کو بھی اس طرح قبول کرنے پر تیار نہیں ہوئے کہ ان کی اپنی انفرادیت غائب ہو جاتی۔ اپنے زمانے کی تبدیلیوں کا احساس غالب کو اپنے تمام ہم عصروں سے زیادہ تھا۔ انہوں نے سرسید سے بھی پہلے، اس حقیقت پر اصرار کیا تھا کہ ہر عہد اپنا آئین خود مرتب کرتا ہے۔ زندگی پیش پا افتادہ ضابطوں اور قوانین کے مطابق نہیں گزاری جا سکتی۔ بے شک، دنیا تیزی سے بدلتی ہے، بدلتی رہی ہے مگر انسانی شعور کا سانچا بہت دھیرے دھیرے تبدیل ہوتا ہے۔

اسی لیے، غالب کو اردو کا پہلا جدید شاعر اور ان کی شاعری کو ایک نئے ذہن کا ترجمان قرار دینے سے پہلے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ غالب نے اپنے شعور کے روایتی عناصر کی حفاظت، اپنے اجتماعی کلچر اور اپنے وجدان کی مدافعت بھی اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی بہ نسبت زیادہ توجہ اور شدت کے ساتھ کی۔ غالب کا شعور اپنے بیرونی کلچر کے جدید ہونے سے پہلے جدید ہو چکا تھا۔ رسمی اور موروثی تصورات اور اقدار کی بے اثری کا احساس بھی غالب رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں انکار، آزادی اور احتجاج کی ایک فطری لہر تھی جسے وہ کسی مجبوری یا مصلحت کی وجہ سے کبھی دباتے نہیں تھے۔ ان کے سماجی رویے، سوچنے کا طریق، ان کی شخصی قدریں اپنے

معاشرے کے عام انسانوں سے بہت مختلف تھیں، آزادہ روی کے خطروں اور نقصانات سے بھی غالب اچھی طرح آگاہ تھے لیکن ایک سوچی سمجھی بے اطمینانی میں ان کا یقین ہمیشہ قائم رہا اور انھوں نے خود کو کبھی بھی کسی بغیر سوچے سمجھے یقین کی عافیت گاہ کے سپرد نہیں کیا۔ وہ ہمہ گیر انقلابات سے دوچار ایک زمانے کے گرداب میں اپنی ہستی کا تماشا دیکھتے تھے، کبھی اس زمانے پر ہنستے تھے، کبھی اس کے ہاتھوں اپنی ہستی کے حشر پر مگر ان کے لیے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ اپنے آپ کو اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیں۔

اس سلسلے میں کولونیل تاریخ اور کولونیل تہذیب سے وابستہ تصورات نے بھی ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا کی ہیں۔ غالب کو سمجھنے کے سلسلے میں بھی ان تصورات نے ایک عجیب وغریب ذہنی صورت حال سے ہمیں دوچار کیا ہے جو بڑی حد تک غیر حقیقی اور غیر فطری ہے۔

مورخوں کا ایک خاصا بڑا حلقہ، جس میں ہندوستانی اور برطانوی علما ایک ساتھ شامل ہیں، اس نکتے پر اصرار کرتے ہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کے لیے نجات کا راستہ صرف ایک تھا، مغربی علوم اور مغربی طریق ومعیار زندگی سے مفاہمت کا۔ گویا کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے کی انڈو مغل روایت کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔ انگریز آئے تو ہمیں سوچنا اور لکھنا پڑھنا اور جینا آیا۔ ہماری روایتیں بے اثر ہو چکی تھیں۔ ہمارے علوم بے وقت کی راگنی تھے۔ ہمارا اسلوب زیست محض بے کار اور بدلتے ہوئے زمانے کے مطالبات کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔ انگریزوں نے مغرب سے علم اور تہذیب اور طرز زندگی کے جو معیار درآمد کیے، ان کے بغیر ہندوستان آگے بڑھنا تو درکنار، زندہ رہنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

سرسید کی علی گڑھ تحریک اور انجمن پنجاب کے قیام کے ساتھ اردو معاشرے میں بھی ایک نئی ذہنی، جمالیاتی اور تہذیبی روایت کا چلن عام ہوا۔ یہ واقعات غالب کی وفات کے بعد ظہور پذیر ہوئے، لیکن ان کے لیے ایک فضا پہلے سے تیار کی جا چکی تھی۔ میں اس وقت اس قصے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا لیکن ایک بات پر توجہ ضرور دلانا چاہوں گا۔ آزاد اور حالی دونوں نے مغرب کی شائستہ قوم کے اسالیب زیست، اس کے علوم وفنون، اس کی روایات ورسوم کو اختیار کرنے پر اصرار

کیا۔ یہ اصرار سرسید اوران کے حلقے کی طرف سے بھی کسی نہ کسی سطح پر ہوتا رہا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے ایک عام ماحول اردو کی ادبی اور تہذیبی روایت، ہمارے انیسویں صدی کے اواخر سے ایک عام ماحول اردو کی ادبی اورتہذیبی روایت، ہمارے اجتماعی ماضی سے برگشتگی کا پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن بالآخر ہوا کیا؟ سرسید، آزاد اور حالی اپنی ذہنی اور جذباتی کشمکش کے گھیرے سے نکل آئے اور انڈو مغل تہذیب اور ہندوستانی مسلم معاشرے کے اجتماعی ماضی کو ایک نئی سطح پر بحال کرنے اور اسے سمجھنے سمجھانے کی کوششیں پھر سے شروع ہوگئیں۔ پرسیول اسپئیر نے ''ٹوائی لائٹ آف دی مغلس'' میں اس بات کا اعتراف ٹھوس تہذیبی اور علمی دلائل کے واسطے سے کیا ہے کہ انگریزی نظام تعلیم کے قیام (۱۸۳۵ء) سے پہلے جو تہذیبی اور معاشرتی تصورات ہمارے یہاں مروج تھے، ان کے پیچھے صدیوں کی روایات اور اقدار اور علم ودانش کی طاقت تھی۔ اس طاقت سے محرومی کے نتیجے میں ہندوستانی معاشرہ تہذیبی کمال کے جس تصور سے دو چار ہوا اس کے مطابق علم اور تہذیب بس سطحی معلومات اور انگریزی میں معمولی شد بد حاصل کر لینے کا نام تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ مغرب کے صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی نے بے شک زندگی کی عام سطح کو بہتر بنانے کی خدمت انجام دی، مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہمارا اجتماعی شعور، حتی کہ ہمارا تہذیبی وجدان بھی ایک اجنبی، کاروباری اور نامانوس روایت کی گرفت میں آ گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم نے ہر تبدیلی کو حالات کا فطری نتیجہ، لازمی اور ناگزیر نتیجہ تسلیم کرلیا اور مغربی مورخوں کے راگ میں راگ ملانے لگے۔ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی مرکزی حیثیت کے خاتمے اور انگریزی زبان کے باضابطہ قیام کو مولوی عبدالحق نے مشرقی روایت اور علوم کی بنیادیں اجاڑنے کی کوشش سے تعبیر کیا۔ (مرحوم دلی کالج، ص ۱۷)۔ خواجہ احمد فاروقی کا خیال تھا کہ ۱۸۳۵ء ہندوستان کی ثقافتی غلامی کا پہلا سال ہے (ماسٹر رام چندر، مصنفہ صدیق الرحمٰن قدوائی، ص ۲۳)۔ لالہ لاجپت کے نزدیک انگریزی کا یہ تسلط ایک لعنت تھا (Zachairios: Rennaiscent India ص ۹۰) ہمایوں کبیر نے اسے مغربی عقلیت کے ہاتھوں ہندوستان کی روحانی شکست کا نام دیا۔ (The Indian Heritage، ص ۱۲۸)۔ اسپئیر کے لفظوں میں یہ ایک عظیم ثقافتی ورثے کی شاندار روایت کا

آخری باب تھا (Twilight of the Mughals ص ۸۳)۔ گویا کہ اپنی صورت حال، تہذیبی ماضی اور اندیشوں سے بھرے ہوئے مستقبل کے مسئلے پر ٹھنڈے دل سے سوچ بچار تو ہوا مگر بہت دیر بعد۔ اس وقت تک پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور واپسی کے راستے ہمارے لیے تقریباً بند ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مغربیوں میں تہذیب کا ایک وسیع اور آزادانہ تصور رکھنے والے علما نے ہندوستانیوں کو تو مغرب شناسی کے راستے پر لگا دیا تھا اور خود ہندوستان کے پرانے آثار اور تہذیبی ماضی کی تفہیم و تجزیے میں مصروف تھے۔ ہاجسن (Hodgson) نے اپنے نیپال کے دورانِ قیام میں ۱۸۳۳ء میں ۱۸۴۴ء تک کے شمالی بودھی ادب کی تحقیق و تفحص کا کام کیا۔ روتھ (Roth) نے ۱۸۴۶ء میں ویدوں کی تاریخ اور ادبی محاسن پر ایک پوری کتاب مرتب کر ڈالی۔ رگ وید پر میکس ملر (Max Muller) کا معروف رسالہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان لکھا گیا۔ قاموسیوں کا ایک گروہ جس میں Rhys Davids, Weber اور Buhlar کے نام ممتاز ہیں، ہند آریائی روایات کی چھان بین میں منہمک تھا اور تاریخی شہادتوں کے مطابق مختلف مغربی ملکوں کے تیس اسکالرز ان کی مدد کر رہے تھے۔

یادگار غالب کے دیباچے میں حالی نے غالب کے شخصی کمال (جو بہر حال انڈو مغل تہذیب کے بلند ترین محاسن کا نتیجہ تھا) اور عہد غالب کے علمی، فکری اور تہذیبی اوصاف کا تذکرہ غیر مبہم لفظوں میں کیا ہے۔ غزل کی صنف پر حالؔی کے اعتراضات اور مغلیہ حکومت کے خاتمے کے ساتھ رونما ہونے والے سیاسی اور سماجی انتشار اور ابتری کے مجموعی ماحول میں ایسا لگتا ہے کہ حالی نے عافیت اور اپنے اجتماعی امتیاز کا ایک جزیرہ بالآخر ڈھونڈ ہی لیا۔ مقدمہ کی فکری اور جذباتی لے اور یادگار غالب کی فکری اور جذباتی لے میں ایک سی بلندی ملتی ہے، مگر دونوں کے منطقے الگ الگ ہیں۔ ورڈ سورتھ کا قول ہے کہ ''ایک روحانی برادرانہ اتحاد مردوں اور زندوں کو یعنی ہر زمانے کے نیک نفس، دلاور اور دانش مند افراد کو باہم مربوط کیے رہتا ہے۔''

غالب کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اسلوب زندگی اور اپنے باطن میں اس اتحاد کو برقرار رکھا اور سائنسی کمالات اور ایجادات سے متحیر اور مرعوب ہونے کے باوجود برقرار

رکھا۔ یہ ایک طاقت ور شعور، ایک تربیت یافتہ بصیرت اور گرد و پیش کے بکھراؤ کے باوجود اپنے داخلی نظم کو قائم رکھنے والی شخصیت کا وصف ہے۔ اس ہوش ربا زمانے میں جب اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ گئے، غالب نے ایک سچے تخلیقی آدمی کی طرح اپنے اوسان برقرار رکھے۔ عقلیت اور ایک طرح کی بے روح نثریت کے شور شرابے نے اس زمانے کی تخلیقی توانائیاں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ پیچھے ڈھکیل دی تھیں۔ ہمایوں کبیر نے اس زمانے کے مجموعی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ:

> یہ تہذیب حالات کا فطری اور لازمی تقاضا تھی۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ ایک بہتر یا زیادہ ترقی پذیر تہذیب ہم پر غالب آتی جارہی تھی، بلکہ، واقعہ یہ ہے کہ جب ایک تہذیب جو نسبتاً خاموشی، غفلت اور بے حسی کا شکار ہوجاتی ہے، اس وقت اسے اگر کسی بیدار، فعال اور نتیجہ خیز حد تک تخلیقی عناصر سے مالا مال تہذیب سے متصادم ہونا پڑے تو وہ زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ کامیاب قوتوں کی گرفت میں چلی جاتی ہے اور زیادہ سرگرمی کے ساتھ نئے تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ ہونے لگتی ہے۔ (Indian Heritage، ص ۴۳۵)

یعنی کہ ہاں بھی اور نہیں بھی۔ گومگو کی وہ کیفیت جو ہمیں سرسید، آزاد، اور حالی کے یہاں دکھائی دیتی ہے، وہی کیفیت اس زمانے کے بہت سے ادیبوں اور سماجی مفکروں اور دانش وروں کے افکار واظہار میں شامل ہے۔ ایک حلقے نے اسے مشرق و مغرب کی روایتوں کا سنگم کہا اور اس سنگم پر رونما ہونے والے ادب کو اینگلو انڈین ادب کا نام دیا۔

تیسری دنیا کی طرح اینگلو انڈین ادب کی یہ اصطلاح بھی ایک واضح سیاسی آہنگ رکھتی ہے۔ مغرب نے اپنی بالادستی کو قائم رکھنے کے جو نفسیاتی طریقے اختیار کیے، یہ رویہ انہی سے مربوط ہے۔ اس رویے کے باعث ہندوستانی ادبیات نے جو نقصان اٹھایا اس کی تفصیل طولانی ہے۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ایک غالب کے استثنا کے ساتھ، ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں کے ادب میں ذہنی کم مائیگی اور اپنے تشخص کی گمشدگی کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ بھارتیہ پنر جاگرن یا بنگال جاگرن (یعنی ہندوستانی نشاۃ ثانیہ اور بنگال کی بیداری) کا سارا تصور کیا واقعی ایک اجتماعی بیداری کا حاصل

تھایا ایک گہری غفلت کا انجام، ضرورت اس بات کی ہے کہ اب نئے سرے سے اس سوال پر غور کیا جائے۔

لیکن اس سوال تک آنے سے پہلے ایک اور مسئلے پر توجہ دی جانی چاہیے۔ خارجی سطح پر اور بیرونی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں نہیں ہوسکتا۔ سماجی زندگی کے ایسے اسالیب جو اسرار سے خالی ہوتے ہیں، تبدیلیوں کا اثر ان پر جلد پڑتا ہے اور یہ اثر دیرپا ہوتا ہے۔ جس طرح فیشن تیزی سے بدلتے ہیں، اسی طرح زندگی کے عام آداب بھی بیرونی اثر کی گرفت میں جلد آجاتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تصورات، انسان کے باطن سے متعلق ذہنی، جذباتی، جمالیاتی، اخلاقی اور نفسیاتی اقدار، احساس کے طور طریقے، ادب اور آرٹ کی ترکیب میں شامل مبہم عناصر پر تبدیلیوں کا جادو اس طرح نہیں چلتا۔ اینگلو انڈین ادب کے وکیلوں نے یہ حقیقت بھلادی۔ علاوہ ازیں، مشرق و مغرب میں ایک اور واضح فرق اور فاصلہ حقیقت کے اجتماعی تصور کا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں محفوظ رہنی چاہیے کہ ادب کی مختلف صنفوں پر بیرونی اور طبیعی اثرات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہاں نثر و نظم کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ خود شاعری کی بیانیہ اور غنائی و داخلی صنفوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ وجدانی اور روحانی واردات کی طرح، موسیقی اور مصوری اور رقص کے اسالیب بھی باہر کا اثر اس طرح قبول نہیں کرتے جس طرح مثال کے طور پر، طرز تعمیر اور ملبوسات یا رہن سہن کی وضعیں یا صنعتیں قبول کرتی ہیں۔ جمالیاتی قدروں میں ایک طرح کی خلقی خودسری ہوتی ہے۔ یہ قدریں اس طرح تبدیل نہیں ہوتیں جس طرح سماجی اخلاقیات کی قدریں۔ ہمارے یہاں اردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی مغربی اثرات کے تحت کئی نئی صنفوں نے فروغ پایا، زیادہ تر نثر کے میدان میں۔ ان میں خود غالب کے سوانحی پس منظر میں، ایک واقعہ جس پر گہرائی سے سوچ بچار کرنا چاہیے، یہ ہے کہ غالب نے انگریزی اسالیب کی مقبولیت اور برطانوی اقتدار میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنا دائرۂ کار بھی سمیٹ لیا۔ ایک منزل ایسی بھی آئی جب غالب شعر گوئی سے تقریباً تائب ہوگئے۔ باہر کی دنیا کا جبران کی نثر تو برداشت کرسکتی تھی، مگر شاعری کو وہ اس سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ غالب نے طبیعی سطح پر تبدیلیوں کا خیر مقدم کیا تھا، مگر اپنے تخلیقی وجدان اور اپنے اجتماعی

وجدان کے مطالبات اور معیاروں سے دست کشی ان کے لے نا قابل قبول تھی۔

کلکتے کے سفر نے غالب کو حیرانی اور اپنے عہد کی تبدیلیوں کے واسطے سے عقل کی بہت سی فتوحات کا گیان تو دیا، لیکن غالب نے یہ سفر جدید زندگی کو سمجھنے کے لیے ہرگز نہیں کیا تھا۔ وہ تو صرف آگ لینے کی خاطر گئے تھے۔ چنانچہ کلکتے سے واپس اس طرح آئے کہ نہ تو آگ ملی نہ کسی طرح کی پیمبری۔ علوم کی نئی منطق، سائنسی اختراعات اور ایجادوں سے باخبر ہونے کے لیے اتنا طویل سفر اختیار کرنے اور سفر میں ایسے رنج کھینچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلّی کی ایک گلی میں بیٹھے بیٹھے بھی ان کا پر تجسس ذہن انہیں اس طرح کی عامیانہ معلومات بہم پہنچا سکتا تھا جنہیں انیسویں صدی کے عقلیت اور معاشرتی انقلابات کی بنیاد تصور کیا گیا اور ہر چند کہ غالب نے (۱۸۶۲ء میں) اپنے حال کی بابت یہ رائے قائم کی کہ ''ملک سراسر بے خس دخار ہوگیا ہے۔ قلمرو ہند نمونہ گلزار ہوگیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق، وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عمل داری سے ناخوشنود ہے۔'' لیکن یہ کسی نئی بصیرت کا اعلان نہیں، ایک طرح کی مصلحت پرستانہ مضمون بندی ہے۔ بجلی کے بلب کی روشنی انہیں جتنی بھی اچھی لگی ہو، ان کے حواس ان کی اپنی بصیرت کے چراغ سے منور رہے اور جب چاروں طرف پھیلا ہوا عقل کا اجالا ان کے اپنے شب چراغ پر غالب آنے لگا تو انہوں نے خاموشی اختیار کرلی۔ اپنے زمانے کی مادّی ترقی سے غالب اگر ہراساں نہ ہوتے تو وہ بھی تجدد اور تعمیر کے قصیدہ خوانوں میں شامل ہوگئے ہوتے اور اس سے زیادہ خراب شاعری کرتے جیسی کہ دنیا دارانہ شعور کی قیادت میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے شعرانے کی۔ عقل کی ثناوستائش کرتے کرتے غالب اچانک گریز کا راستہ پکڑ لیتے ہیں اور یہ ساری تمہید ایک نئی بصیرت کا عقبی پردہ بن کر رہ جاتی ہے۔

بہ دانش غم آموزگار من است	خزان عزیزاں بہار من است
چراغے کہ بے روغن افروختم	دلے بود کز تاب غم سوختم
زیز داں غم آمد دل افروز من	چراغ شب واختر روز من

(ابرگہربار)

خیر، یہ سارا قصہ تحقیق سے زیادہ فکری تجزیے کا طلب گار ہے۔ چنانچہ اپنی مشرقیت کا مفہوم متعین کرنے کی جو روش ایڈورڈ سعید کی Orientatism (۱۹۷۸ء) سے ہماری موجودہ ادبی منظرنامے پر پھیلی ہوئی اپنے تشخص اور اپنے دیسی پن (Nativism) کی بحث میں اپنے ایک منطقی نتیجے تک پہنچتی ہے، اس نے کولونیل (olonial اور (Post Colonial) کے تاریخی تصورات کی آویزش کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔

غالب کے ان تمام ہندوستانی معاصرین کی شاعری جو نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے، ایک عجیب وغریب نثریت زدہ، تخلیقی جوہر سے بالعموم عاری اور یک سطحی مفہوم رکھنے والے بیانیہ کی شکل میں سامنے آئی۔ ہماری کھڑی بولی ہندی کی شاعری نے تو اس وقت بس گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ کچھ شاعروں نے (مثلاً یگیہ دت تیواری) یا تو صرف ماضی کے قصیدہ باندھے اور عہد رفتہ کی عظمت کا احساس بہت نثری انداز میں جگانے کی کوشش کی، یا پھر بعضوں نے (مثلاً رانی لکشمی بائی کے معاصر ہر دَیش نے اس زمانے کے ادیبوں کی خستہ حالی کا ماتم کیا۔ بھارتیندو ہریش چند نے اپنے ڈرامے بھارت دردشا میں محض رسمی طور پر انگریزوں کی لوٹ مار کا نقشہ مرتب کیا ہے۔ اس نقشے کی تخلیقی قدر و قیمت بہت معمولی ہے اور اس کی حیثیت صرف تاریخی ہے۔ ایک حلقہ ایسے شاعروں کا بھی تھا (مثلاً سیوک) جنھوں نے منافقت کا راستہ اپنایا اور انگریزوں کے لیے اپنی وفاداری، سعادت مندی کے جذبوں کی نمائش کرتے رہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ کلکتہ چونکہ مغربی اقتدار کا پہلا مرکز تھا اور ذہنی بیداری کی لہر سب سے پہلے بنگال میں پھیلی اس لیے بنگالی ادیبوں اور شاعروں کے یہاں بھی ایک ’’ترقی یافتہ‘‘ تخلیقی بصیرت کی تلاش کی جا سکتی ہے۔ قوم پرستانہ جذبات کی ترجمانی بے شک، اس عہد کی بنگالی صحافت اور ادب میں عام دکھائی دیتی ہے۔ وہاں سے شائع ہونے والے اخبارات، فرینڈس آف انڈیا (Friends of India)، انگلش مین (Englishman)، بنگال ہکارو (Bengal Hukaru)، کلکتہ ریویو (Calcutta Review) اور ہندو پیٹریٹ (Hindu Patriot) میں قوم پرستی کا آہنگ خاصا اونچا تھا، اس حد تک کہ لارڈ کیننگ نے انہیں اپنے ایک

اعلانیے (۱۸ر مئی ۱۸۵۷ء) کے مطابق اپنی راہ تبدیل کرنے یا چپ رہنے کی تائید کی۔ لیکن اس زمانے میں بنگال کے ادیبوں نے جو تخلیقات پیش کیں، مثلاً رام نرائن تارا کانتا کا ڈراما کلین، کلا، سروسوا، (جو مارچ ۱۸۵۷ء میں اسٹیج کیا گیا) یا پھر ۱۸۵۷ء کے بعد بنکم چند چٹرجی کا شائع ہونے والا آنند مٹھ اور ہیم چند چٹو پادھیائے کی کتاب بھارت سنگیت، ان میں احتجاج کا لہجہ سخت اور درشت اور قوم پرستی بلکہ نظریاتی احیا پرستی کا رنگ نمایاں ہے۔ البتہ ان کی ادبی سطح معمولی اور مشکوک ہے۔ بنگالی تھیٹر میں کچھ بامعنی تجربے (مدھوسودن دت کے واسطے سے) بھی ہوئے اور بنگالی ڈرامے نے ایک نئے سماجی شعور اور وابستگی کو ترقی دی۔ لیکن شاعروں میں غالبؔ کے مرتبے کی ایک بھی مثال اس عہد کے ہندوستانی ادب میں نہیں ملتی۔

تخلیقی طاقت کے لحاظ سے انیسویں صدی کے مراٹھی، گجراتی، تمل، تیلگو ادب کا خانہ بنگالی سے بھی زیادہ خالی ہے۔ نظم کی بہ نسبت نثری صنفوں نے تھوڑی زیادہ سرگرمی دکھائی۔ لیکن ہندوستانی ادبیات میں، مجموعی طور پر دیکھا جائے تو رابندرناتھ ٹیگور سے پہلے ایک بھی ایسی شخصیت دکھائی نہیں دیتی جسے غالب یا کلاسیکی ادب کے ہندوستانی مشاہیر کی صف میں رکھا جاسکے۔

انیسویں صدی میں ہندوستانی ادبیات کے سیاق میں جمالیات اور شعریات کا جو بھی نظام مرتب اور وضع کیا جائے گا اس کی اڑان محدود، سطح عامیانہ اور مزاج صحافتی ہوگا۔ عالم گیر ادبی قدریں جو تاریخی، طبیعی اور جغرافیائی سرحدوں کو عبور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جن کی بنیاد پر ہم دنیا کے بڑے ادیبوں اور شاعروں میں رفاقت اور مونست کے عناصر کی دریافت کرتے ہیں، انیسویں صدی کے تمام ہندوستانی شاعروں میں ایک غالب کے استثناء کے ساتھ، ہمیں ناپید نظر آتی ہیں۔ غالب کو اپنے ہم عصر ملے بھی تو کہاں؟ فرانس میں لے دے کے ایک بودلیر (Les Fleurs du Mal) (۱۸۲۱ تا ۱۸۶۷۔ بدی کے پھول کی اشاعت ۱۸۵۷ء)، جرمنی میں ہائنے (۱۷۹۷ء تا ۱۸۴۲ء)۔ غالب کی حسیت کے تناظر میں ہائنے کے یہ الفاظ کچھ خاص معنی رکھتے ہیں کہ "میں نے شعری کامرانیوں کے واسطے سے کسی بڑے نصب العین تک رسائی کو اپنا ہدف نہیں بنایا۔ (کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے)۔ میرے نغموں کو سراہا جائے یا انہیں

اعتراضات کا نشانہ بنایا جائے، مجھے اس سے زیادہ سروکار نہیں ہے۔ مگر میرے تابوت پر ایک تلوار ضرور رکھ دینا کیونکہ میں انسانی آزادی کی جنگوں کا ایک اچھا سپاہی رہا ہوں! (سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری)''۔ اسی طرح امریکہ کا والٹ وہٹمن (۱۸۱۹ء تا ۱۹۸۲ء) جس کی کتاب گھاس کی پتیاں ۱۸۵۵ء میں شایع ہوئی اور جس کا دعوا تھا کہ اس کی شاعری انسانی جسم اور روح دونوں کا احاطہ کرتی ہے اور انگلستان کے رومانی شعرا (Romantic) ولیم ورڈسورتھ (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۵۰ء) شیلے (۱۷۹۲ء۔ ۱۸۲۲ء) اور کیٹس (۱۷۹۵ء۔ ۱۸۲۱ء) اور روس کے پشکن (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۳۷ء) غالب کے ہم عصر ہیں۔ غالب کے یہاں انسانی صورت حال کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کا جو ادراک ملتا ہے، جو سچی اور گہری اور احساسات میں رچی ہوئی انسان دوستی ملتی ہے، ان کے تخیل میں جو رفعت ہے، بصیرتوں اور حواس کی آزادی اور بے کناری کا جو شعور ملتا ہے، انسانی عروج کے تماشے میں شامل زوال کے مختلف عناصر کی تفہیم و تعبیر کا جو سلیقہ، اپنے انفرادی تجربے اور اپنی نظر پر جو اعتماد دکھائی دیتا ہے، وہ صرف بڑی شاعری اور بڑے ادب کا شناس نامہ ہے۔ معنی کی اتنی پرتیں، تجربے کی اتنی جہتیں اور سطحیں، لفظ کے امکانات پر غالب کی جیسی گرفت ہمیں انیسویں صدی کے کسی اور اردو شاعر اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے کسی بھی لکھنے والے کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ اس حساب سے غالب کو صرف انیسویں ص صدی کے ہندوستان کی تخلیقی بلندی کا سب سے بڑا نشان یا مشرقی روایات کا سب سے بڑا عارف سمجھنا اور اس سے بھی آگے بڑھ کر عالمی ادبیات کے پس منظر میں غالب کے امتیاز کو نہ پہچاننا غالب کے ساتھ زیادتی ہے۔ غالب اپنے عہد میں دنیا کے سب سے بڑے، شاعر یا کم سے کم سب سے بڑے شاعروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ غالب کی یہ حیثیت ان کی تفہیم کا ایک نیا تناظر مہیا کرتی ہے۔ اس تناظر کے مطابق غالب اردو کی ادبی روایت سے تعلق رکھنے والے شاعروں میں پہلے عالمی شہری ہیں اور ان کا شعور اپنے انفرادی رابطوں اور اپنے مخصوص نشانات کے باوجود ایک آفاقی اور عالم گیر مزاج اور مفہوم کا حامل ہے۔

❁❁❁

جمال عبدالواجد

غیر متداول کلام غالب

یوں تو بچپن سے غالب کے اشعار کان میں پڑتے رہے، لیکن یہ ان کے متداول دیوان تک ہی محدود تھے۔ یہ بھی سنا تھا کہ ان اشعار کے علاوہ غالب نے اور بھی بہت سا کلام کہا تھا، لیکن یہ کہ ان کا ابتدائی کلام تھا جو نہایت مغلق "روغنِ گُلِ بھینس کے انڈے سے نکال" قسم کا[1]۔ نیز اپنا دیوان مرتب کرتے وقت، غالب نے ان سب اشعار کو یکسر خارج کر دیا تھا۔ یہ تینوں مفروضے اتنے بین سچ مانے جاتے تھے کہ ان کے بارے میں کسی سوال اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔

۲۰۰۲ء میں مجھے غالب کے غیر متداول کلام[2] پر تجزیاتی کام (جس میں تحلیل اماری شامل تھی) کرنے کا موقعہ ملا۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ تینوں مفروضے قطعی بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں۔

غیر متداول کلام کو محض زمانی لحاظ سے 'ابتدائی کلام' کہنا جائز نہیں۔ یعنی، خالص سنین کی بنیاد پر متداول اور غیر متداول کلام کو متفرق نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اول، تو خود متداول کلام کا تقریباً ساٹھ فیصد کلام انہیں سنین کا ہے[3] جس کا غیر متداول کلام۔ دوسرے، کلام غالب کی تاریخی ترتیب پر کوئی باقاعدہ کام نہیں ہوا ہے[4]۔ اور جو ہوا ہے اس کی بنیاد، طریقہ کار، اور صحت بحث طلب ہے[5]۔ تیسرے، کسی شاعر کی شاعری کے ادوار محض (تنہا) زمانی (سنین) کی بنیاد پر نہیں قائم کیے جاتے ہیں، بلکہ ان امتیازی خصوصیات کے مطابق جو اس شاعر کے دور کی شاعری کو مشخص کرتے ہیں[6]۔ جہاں تک راقم کو علم ہے، کلام غالب کے ادوار کے سلسلے میں تاثراتی بیانات تو ہیں، لیکن کوئی تحقیقی یا تجزیاتی کام نہیں ہوا ہے[7]۔

جہاں تک غیر متداول کلام کے مشکل و دقیق ہونے کا سوال ہے، اول تو اعلیٰ قسم کا علم لازمی طور پر مشکل ہوتا ہے، بلکہ ہونا ہی چاہیے[8]۔ دوسرے، "ایسے مطالب بھی ہوتے ہیں جو شاید آسان اور عام فہم زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ہیں"[9] پھر زمانے کا مزاج بدلتا ہے "وہی چیزیں جو کل تک مشکل

اور شرح طلب تھیں، آج آسان اور واضح نظر آتی ہیں''[10]۔ تیسرے، غیر متداول کلام میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جو کسی طرح متداول دیوان سے مشکل تر نہیں کہے جا سکتے[11]۔

اب رہا یہ مفروضہ کہ یہ کلام ... غیر متداول کلام .... غالب کا رد کردہ کلام ہے، تو اولاً یہاں ایک معنیاتی و منطقی التباس ہے۔ انتخاب لازماً محدود ہوتا ہے۔ یعنی اس میں کچھ لینا ہوتا ہے۔ کچھ چھوڑنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جو کلام انتخاب میں نہیں آسکا وہ ''کوئی گلی سڑی شے تھا جسے خارج از دیوان قرار دیا گیا''[12] بے شک غالب نے اپنے ایک دیوان .. جواب متداول دیوان کے نام سے معروف ہے .. کے مقدمہ میں لکھا تھا''.... امید کہ سخن سرایانِ سخنورستانِ پراگندہ ابیاتی را خارج ازیں اوراق یابند، از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ ایں نامہ سیاہ نشاسند و چامہ گرد آور را در ستائش و نکوہشِ آن اشعار ممنون و ماخ نسگالند ......''۔[13] لیکن یہ محض ایک شاعرانہ مبالغہ تھا۔ اسے لفظ بہ لفظ سچ نہیں سمجھنا چاہیے۔[14]

پھر نہ جانے کیوں تصور کرلیا گیا کہ یہ غالب کا پہلا اور آخری انتخاب تھا، جب کہ یہ ایک جاری وساری عمل تھا[15]۔ اس بارے میں مولانا آزاد کا بیان قابلِ نقل ہے''..... [غالب] دیوانِ اردو، غالباً پہلے مطبع اودھ اخبار میں اور پھر مکرر سہ کرر دہلی و لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں جس قدر اردو کلام کہا، وہ نئے ایڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا۔ جو پہلا ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپا تھا، اسی کی نقلیں چھپتی رہیں .. معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کی کلیات نظم کے ہر ایڈیشن میں نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا۔ مگر افسوس اردو دیوان کی قسمت اس بارے میں نارسا رہی اور نیا کلام اس میں شامل ہوتا نہ رہا۔ اس کا ثبوت وہ متعدد غزلیں، قطعات، رباعیات اور بعض اردو قصائد جو بعض حضرات کے پاس قلمی موجود ہیں اور مطبوعہ دیوان میں 'ان کا پتہ نہیں''۔[16]

آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاعر کا انتخاب کسی شعر کے اچھے یا برے ہونے پر حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ شعر کے اچھے برے ہونے کا معیار ٹھوس تنقیدی اصولوں اور پیمانوں پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی فرد .. خواہ وہ خود شاعر ہو...... کی داخلی پسند پر نہیں۔[17]

خلاصے میں چند غلط مفروضات اور کچھ اتفاقات و حادثات کی وجہ سے اس عظیم شاعر کے کلام کا ایک معتذبہ حصہ عام قارئین کی نظروں سے پوشیدہ اور ناقدین کی مستحق توجہ کا محتاج رہا۔

گو غالب کے کلام کے کچھ مجموعوں میں ان کا غیر متداول کلام دستیاب ہے، لیکن ان کی ترتیب یا

دیگر وجوہ سے ان سے عام قاری استفادہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً، دیوانِ غالب اردو، نسخۂ ثانی (عرشی) غالب کے تقریباً تمام کلام (متداول اور غیر متداول) پر محیط ہے۔ لیکن اس میں [غیر متداول کلام] یکجا نہیں منتشر ہے۔ بہر حال، یہ اب دستیاب نہیں۔ اس کا کاغذ اتنا خستہ ہوگیا ہے کہ جگہ جگہ سے ٹوٹنے لگا ہے[۱۸]۔ دیوانِ غالب کامل[۱۹] اپنے نام پر صادق ہے، لیکن چونکہ اس میں پورا کلام متداول و غیر متداول... سنین کے اعتبار سے مرتب ہے، لہذا غیر متداول کلام الگ سے نہیں دیکھ جا سکتا۔ 'غالب کا منسوخ دیوان'[۲۰] میں کچھ ایسا کلام[۲۱] شامل ہے جو دوسرے دواوین میں نہیں، اور لہذا مشکوک۔ پھر نسخۂ عرشی کی طرح یہ بہت کمیاب اور عام قاری کی دسترس سے باہر۔

غرض آج غالب کے غیر متداول کلام کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جو عام قاری کو آسانی سے مل سکے اور وہ اسے سہولت سے استعمال کر سکے۔

اس خلا کا مجھے شدت سے احساس تھا، تاہم کام کی نوعیت اور اپنی استعداد و حالت دیکھ کر اس کام کو اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ایک بیچ کے راستے کے طور پر، راقم نے غیر متداول کلام کے انتخاب کا منصوبہ بنایا۔ لیکن میرے عزیز کرم فرما، جناب عبدالرشید صاحب بضد تھے کہ نہیں پورے غیر متداول کلام کا مجموعہ تیار ہونا چاہیے۔ اسی دوران محترم فاروقی صاحب نے اپنے توسیعی خطبہ[۲۲] میں اس ضرورت کا ذکر کیا۔ راقم کے لیے یہ اشارہ[۲۳] کافی تھا۔ چنانچہ اب یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔

راقم کو مجموعہ کے نامکمل و ناقص ہونے کا ایمانداری سے اعتراف ہے۔ ایک تو اس میں قصائد، قطعات و مثنویات نہیں شامل ہیں۔[۲۴] نیز کچھ کلام، جو مستند دواوین کے باہر ملا تھا، اسے بھی مجموعہ میں نہیں لیا گیا، کیونکہ یہ تحقیق طلب تھا اور اس لیے راقم کے دائرہ سے باہر۔ اس سب پر مستزاد راقم کی علمی کم مائیگی[۲۵]، وسائل کا فقدان اور خرابیِ صحت۔

اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کی اردو نظم کی کلیات کا ایک جامع و مستند ایڈیشن ترتیب متن کے جدید اصولوں کے مطابق ہو۔ بلکہ اچھا تو یہ ہوگا کہ یہ شیکسپیر کے (Variorum) ایڈیشن کے طرز پر مرتب کیا جائے۔ ظاہر ہے یہ ایک جماعتی کام ہے جو صرف ایک ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے۔

حواشی:

۱۔ یادگارِ غالب (الطاف حسین حالی) ص ۱۱۱۔ نیز تذکرہ کاملانِ رامپور (عبدالقادر غمگین)

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی (کلامِ غالب: کچھ مسائل۔ توسیعی خطبہ بیادِ کمال احمد صدیقی۔ غالب نامہ، شمارہ ۱۸۔۲۰ رجولائی ۲۰۱۴ء) اس کلام کے مختلف ناموں ...... 'مسترد کلام'، 'قلم زد کلام'، 'غیر مطبوعہ کلام'... پر مدلل بحث کی ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مروج نام ..... غیر متداول کلام ...... ہی سب سے مناسب ہے۔

۳۔ دیکھیے: گوشوارہ تعدادِ اشعار، معہ فیصد، بہ اعتبارِ سنین (ضمیمہ)۔ نیز: ''متداول دیوان کا بڑا حصہ غیر متداول دیوان میں موجود ہے'' (فاروقی: محولہ بالا، ص ۱۵)۔ عرشی نے ۱۸۲۲ء کو غالب کی ریختہ گوئی کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ (دیوان غالب، نسخۂ ثانی، مقدمہ، ص ۱۵)

۴۔ کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کی اولین کوشش مفتی انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے وقت کی۔ انھوں نے غالب کے وہ اشعار جو پچیس برس پہلے کہے گئے تھے، ان کو بعد کے اشعار سے جدا ترتیب دیا (دیوانِ غالب جدید، المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ، تدوین مفتی انوار الحق، آگرہ، مفیدِ عام پریس، ۱۹۲۱) تاہم سید عبداللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے غالب کے کلام کی تاریخی ترتیب کی اہمیت پر باقاعدہ لکھا اور اس کا خاکہ اپنی کتابِ 'غالب: حیات اور کلام کا تنقیدی مطالعہ (Ghalib: A Critical appreciation of his life & works) میں دیا۔ انھوں نے کلامِ غالب کے چار ادوار مقرر کیے تھے۔ بعد کو انھوں نے پورے دیوان کو تاریخ وار مرتب کیا۔ لیکن ان کا مرتبہ دیوان ضائع ہوگیا۔ اس کے چند اوراق عرشی صاحب کو ملے اور اب شاید رضا لائبریری میں ہیں۔ (مقدمہ محولہ بالا ص ۲۷) اس کے بعد شیخ محمد اکرام نے پہلے 'غالب نامہ' اور پھر آٹھ سال بعد، نظرِ ثانی کر کے 'ارمغانِ غالب' میں منتخب کلامِ غالب تاریخی ادوار کے اعتبار سے ترتیب دیا۔ انھوں نے پہلے دو ادوار میں اردو کلام، اور تیسرے اور چوتھے ادوار میں اردو اور فارسی کلام، اور پانچویں دور میں اردو...... اور آخری میں کچھ فارسی ...... کلام کا انتخاب دیا۔ ('ارمغان غالب: مرزا غالب کے اردو اور فارسی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب تاریخی ترتیب سے'، بمبئی، تاج آفس، ب ت)۔ سب سے آخری کوشش 'دیوان غالب کامل: تاریخی ترتیب سے' (کالی داس گپتا رضا) کی ہے۔ اس میں کلامِ غالب کے گیارہ ادوار طے کیے گئے ہیں۔ (دیکھیے: حاشیہ ذیل)۔

۵۔ مثال کے طور پر دیوانِ غالب کامل: تاریخی ترتیب سے (کالی داس گپتا رضا) میں یوں تو کلام غالب کے گیارہ ادوار طے کیے گئے ہیں لیکن، یہاں دور پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ مزید

ہر دور کے تحت غزلیات الگ، الگ سنین میں تقسیم کی گئی ہیں۔ اس طرح غالب کا پورا کلام ۴۲ سنین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں ایسے سن بھی ہیں جیسے: ۱۸۵۴، ۱۸۵۵ (جو ۱۸۵۵ء سے مختص ہے)، نومبر ۱۸۵۴ تا مئی ۱۸۵۷، مارچ ۱۸۶۱ اور قبل از مارچ ۱۸۶۱۔ بعض سن کے تحت صرف ایک شعر ہے۔ (دیکھیے: گوشوارہ محولہ بالا)۔ اتنی باریک تقسیم کا کوئی طریق کار بھی نہیں بتایا گیا ہے۔ اس ضمن میں بس مندرجہ بیان ہے ''... کلام کے زمانۂ فکر کے تعین کے یہ قاعدہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر کسی غزل کا ایک شعر بھی کسی قدیم تر ماخذ میں پایا گیا، تو اس پوری غزل کو قدیم تر ماخذ میں شامل سمجھا گیا ہے، کیونکہ پوری غزل نہ کہی گئی ہو تو بھی اس کی اساس اسی عہد میں رکھی گئی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اس غزل کے کچھ اشعار واقعی بعد میں کہے گئے ہوں مگر ایسے اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ... '' (۲۴)۔ اس دعویٰ کا کوئی جواز نہیں دیا گیا ہے۔ تعینِ سنین کے استناد بھی نہیں۔ محض چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور وہ بھی کسی مشہور یا مستند کتاب سے نہیں۔ مثلاً، یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں، از محسن بن شبیر، یا 'حبسیۂ غالب'، از رغیب حسین (اغلب ایک مضمون مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو فروری، ۱۹۷۱) (۱۱)۔ ان حالات میں تعین قیاسی ہی کہلائے گا، تحقیقی و مستند نہیں۔ ضمنی طور پر، کتاب میں اشاریہ میں کتاب کا نام ہے، لیکن مصنف کا نہیں۔ اور کتابیات میں کتاب کا نام ہے مصنف کا نہیں۔

۶۔ مثلاً اقبال کی شاعری کا دورِ اول، وطنی قومیت سے، اور دوسرا وطنی قومیت کی مخالفت اور اتحادِ اسلامی کی حمایت سے مشخص ہے۔

۷۔ 'غالب: تقلید و اجتہاد' (خورشید الاسلام) کا موضوع ''... غالب کا ابتدائی دور ہے...... [وہ کلام] جو انہوں نے کم و بیش پچیس سال کی عمر تک جمع کیا تھا اور جس پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے......''۔ دراصل اس کا موضوع غالب کی شاعری میں فارسی شعرا (اور ناسخ) کے اتباع اور انحراف ہے۔ غالب کی شاعری کے ادوار کا قیام نہیں۔ اسی لیے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ 'متداول' اور 'غیر متداول' دونوں دواوین سے ہیں۔ ضمنی طور 'دیوان غالب کامل (محولہ بالا) کے مطابق، فاضل مقالہ نگار نے ایک شعر ('پلا دے اوک سے ساقی، جو مجھ سے نفرت ہے؛ پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے شراب تو دے')، ۱۸۱۲ء کا بتایا ہے جبکہ وہ ۱۸۲۱ کی ایک غزل کا ہے (۱۸-۱۹)۔ اگر یہ صحیح ہے، تو یہ مصنف کا تحقیق میں احتیاط پر حرف اٹھاتا ہے۔ دیوانِ غالب، نسخۂ اول (عرشی) میں غالب کی ریختہ گوئی کے دو دور قائم کئے گئے ہیں: پہلا دور۔ آغاز

شاعری (۱۸۱۲) سے ۱۸۲۱ء تک۔ دوسرا دور۔ ۱۸۵۰ سے ۱۸۶۷ء تک۔ یعنی قلعہ معلّیٰ سے تعلق سے انتقال تک (غالب کا آخری شعر..... دمِ واپسیں برسرراہ ہے:: عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے'')۔ بیش اشعار ہیں (غزلیات، مخمس، رباعیات)۔ ان میں سے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۷ء تک ۳۵۰ سے کچھ کم اشعار ہیں، جو کل اشعار کا دس فیصد ہے۔ یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ ایک شاعر کے دو ادواروں میں اتنا تفاوت ہو۔ یعنی ایک دور میں ۹۰ فیصد اور دوسرے میں صرف دس فیصد۔ نیز ان ادوار کی امتیازی خصوصیات جو ان کو مشخص کرتی ہوں بھی نہیں بتائی گئی۔ اور شاید یہ ممکن بھی نہیں، کیونکہ ''غالب کے پہلے اور دوسرے دور میں بعض خصوصیات مشترک ہیں'' (مجیب، محولہ بالا ۱۷)۔ دراصل غالب کی ریختہ گوئی کی مدت اتنی مختصر.....صرف ۲۵ سال ..... ہے۔ کہ اس میں سنین کے اعتبار سے ان کی شاعری میں مختلف ادوار.....متداول وغیر متداول ...... طے کرنا ممکن نہیں۔ ویسے بھی شاید ایک غزل گو شاعر کے یہاں ادوار کے تلاش کے بجائے کلام میں مختلف اسالیب کی پہچان زیادہ مفید ہو۔ راقم کے ناقص خیال میں متداول وغیر متداول کلام کے تعلق سے اگر ان دونوں کلاموں میں فارسی تراکیب کی نوعیت اور استعمال کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو خاصہ دلچسپ و کارآمد ہوسکتا ہے۔ مثلاً 'بیضۂ طاؤس خلوتاں'، آبلۂ نادمیدہ'، 'گرسنۂ مزدورِ طربگاہِ رقیب' یا 'آفت زدۂ عرضِ دو عالمِ نیرنگ'، جیسی تراکیب کا تجزیاتی مطالعہ متداول کلام میں تراکیب سے کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ کہا جاتا ہے کہ ارسطو کی اکادمی کے دروازے پر جلی حروف میں منقش تھا 'جن کی طبعیت میں سہولت پسندی ہو، وہ یہاں داخل ہونے کی زحمت نہ کریں'۔

۹۔ مجیب (محولہ بالا ۲۷)

۱۰۔ دیوانِ غالب (مالک رام) (مقدمہ، ۳۶)

۱۱۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ متداول دیوان مرتبہ رشید حسن خاں اور مرتبہ مالک رام میں ضمیمہ میں غیر متداول کلام شامل کیا گیا ہے۔ راقم غیر متداول کلام سے ایسے اشعار کا ایک انتخاب، معہ ضروری حواشی و اشارات، مرتب کررہا ہے۔ یہ بھی پتہ لگا ہے کہ کولمبیا یونیورسٹی میں کچھ اسی قسم کا کام ہورہا ہے۔ (فاروقی محولہ بالا، ۲۲)

۱۲۔ فاروقی (محولہ بالا، ۱۹)

۱۳۔ مقدمہ دیوان۔ اسی بات کو انہوں نے اپنے ایک خط بنام عبدالرزاق شاکر دہرایا تھا...... '' پندرہ برس کی عمر تک مضامینِ خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز

آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔" (غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، جلد۲ ص ۸۴۶)

۱۴۔ اس کی تصدیق گوشوارہ میں دیے اعداد سے بھی ہوتی ہے۔ فاروقی نے اس کی ایک اور تاویل کی ہے۔" اغلب یہ ہے اعلان سے ان کی مراد یہ تھی کہ بہت سے اشعار اور غزلیں عوام میں غالب کے کلام کے نام سے مشہور ہونے لگی تھیں اور غالب یہاں ان اشعار سے برأت کا اعلان کر رہے ہیں"۔ (محولہ بالا ص ۲۰)

۱۵۔ موجودہ معلومات کے مطابق انتخابِ رامپور (۱۸۶۶) آخری انتخاب تھا۔ چونکہ غالب سے متعلق دستاویزات اب بھی دریافت ہو رہی ہیں۔ (مثلاً دیوانِ غالب بخطِ غالب)، لہٰذا اسے ابھی کھلا باب سمجھنا چاہیے۔

۱۶۔ الہلال (ادبیات: آثار علمیہ خطیہ) (جلد۴، مارہ ۲۴، ص ۴۵۹؛ مطابق ۱۷ ارجون ۱۹۱۴)۔ نیز "..... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب دیوان متداول میں منسوخ اشعار بھی شامل کرتے رہے......"۔ (مقدمہ، دیوانِ غالب، نسخۂ ثانی، ص ۲۲، حاشیہ) (عرشی)

۱۷۔ اس سے الگ، ادب میں شاعر (اور دیگر ادبا) کے کچے، اصلاح شدہ مسودوں پر تحقیق ہوتی ہے تاکہ شاعر (یا ادیب) کی پسند کے بارے میں معلومات حاصل ہوں۔ انگریزی میں اس کی وافر مثالیں موجود ہیں۔

۱۸۔ دلچسپ بات ہے کہ نسخۂ اول جو ۱۹۵۸ء میں چھپا اس کا کاغذ دبیز اور عمدہ ہے۔ اس لیے وہ آج بھی نسخۂ ثانی سے جو ۱۹۷۱ء میں چھپا ہزار درجہ بہتر حالت میں ہے۔

۱۹۔ مرتبہ کالی داس گپتا رضا (محولہ بالا)۔

۲۰۔ غالب کا منسوخ دیوان (مرتبہ مسلم ضیائی کراچی، ایجوکیشنل پریس، ۱۹۶۹)۔ راقم جناب ابوسعد اصلاحی، رامپور رضا لائبریری کا مرہون ہے۔ انہوں نے اس کی نقل ارسال فرمائی۔

۲۱۔ مثلاً مخمس بر غزلِ سعدیؒ وغیرہم۔

۲۲۔ محولہ بالا۔

۲۳۔ "چاک مت کر جیب بے ایامِ گل؛؛ کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے"۔

۲۴۔ اس میں راقم کو غالب کی تقلید حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے انتخابِ رامپور میں یہ اصناف نہیں لی تھیں۔ "...... اس درویش نے صرف غزلوں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصاید و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا ہے ......" (منقولہ، مقدمہ، دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۳۰)۔ یہ بعد کو بھی نہیں بھیجا گیا، چنانچہ انتخاب میں یہ شامل نہیں۔

❁❁❁

شاہ نواز فیاض

تفسیر غالب اور گیان چند جین

اردو شاعری میں غالب ایسا نام ہے، جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ غالب اور اقبال پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، اتنا اردو کے کسی بھی شاعر وادیب کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ باوجود اس کے ابھی ایسے بہت سے گوشے تشنہ ہیں، جن پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف ان دونوں پر لکھا جا رہا ہے، بلکہ ان کے ناقدین وشارحین بھی موضوع بننے لگے ہیں۔ یوں تو غالب کے کلام کی کئی لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پچاس سے زائد تفسیریں کلام غالب کی لکھی جا چکی ہیں۔ انہیں مفسرین کلام غالب میں ایک نام گیان چند جین کا بھی ہے۔

گیان چند جین کا شمار ایسے عظیم ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی زندگی کا نصف صدی سے زیادہ اردو زبان وادب کی خدمت کی نذر کیا۔ ان کی خدمات کا دائرہ کار بہت وسیع اور غیر معمولی ہے۔ انھوں نے اپنا سارا اثاثہ اردو زبان میں چھوڑا ہے۔ اردو دنیا میں ان کی شناخت ایک استاد، محقق اور ماہر لسانیات کی ہے۔ ان کی تصانیف مختلف یونیورسٹیوں میں نصاب کی کتابوں کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ان کتابوں کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ بالخصوص تحقیق سے وابستہ اساتذہ اور طلبہ میں ان کی تصانیف کی مقبولیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جو تحقیق میں مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہیں اردو ادب کے مختلف نظریات، رجحانات اور تحریکات کے پیرو کاروں میں یکساں مقبول ہیں۔ اس لیے تحقیق کا طالب علم تحقیقی مقالے پر کام کا آغاز کرنے سے پہلے ان کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں جائے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے اہم کاموں میں ایک کام 'تفسیر غالب' بھی ہے۔

گیان چند جین کی ''تفسیر غالب'' غالب صدی کے موقع پر شائع ہونی تھی۔ لیکن یہ کتاب ۱۹۷۱ کے آخر میں شائع ہوئی۔ جب کہ اس کام کو گیان چند جین نے ۱۹۶۸ء ہی میں مکمل کر لیا تھا۔ انھوں نے کل ۱۹۵۶ اشعار کی تشریح کی ہے۔ جن میں ۱۴۳ اشعار قصیدے کے، ۱۵۰۸ اشعار غزل کے اور ۱۲ رباعیوں کی تشریح کی ہے۔ اس کے علاوہ یادگار نالہ سے ۱۱۸ اشعار، خودنوشت دیوان سے

۱۶۹ اشعار اور ضمیمہ نسخۂ عرشی سے ۱۶ اشعار۔ یہ سب مل کر ۱۹۵۶ کی تعداد ہوتی ہے۔ اسی تفصیل اور تعداد کا ذکر گیان چند جین نے اس کتاب ''تفسیر غالب'' کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ اس تفسیر کے لیے انھوں نے نسخۂ عرشی کو پیش نظر رکھا۔ البتہ ۱۷۵ اشعار ایسے ہیں جس کے لیے انھوں نے خود نوشت دیوان اور ضمیمۂ نسخۂ عرشی کی مدد لی ہے۔

تفسیر غالب لکھتے وقت تقریباً سارے لوگوں نے 'نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا' سے شروع کیا ہے۔ لیکن گیان چند جین نے اس غزل کے مقطع سے اپنی تفسیر کا آغاز کیا ہے۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

گیان چند جین نے اس تفسیر کے لکھنے میں بڑی احتیاط برتی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جب اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے ابتدا میں ماہر غالب امتیاز علی عرشی کی خدمت میں چند اشعار بھیج کر اس کی تشریح چاہی۔ جب امتیاز علی عرشی نے ان اشعار کی تشریح بھیجی تو گیان چند جین دوسرے محققین سے مل کر غالب کے دقیق اشعار کے حل معنی میں مدد چاہی۔ لیکن گیان چند جین امتیاز علی عرشی کی تشریح کے کچھ حصے سے مطمئن ہوئے اور کچھ میں کسی قدر شبہ کا اظہار کیا، اور یہی وہ چیز تھی جو ان کے اعتماد میں اضافہ کر گئی۔ اور انھیں کامل یقین ہو گیا کہ وہ غالب کے ذہن کی کجی اور ان کے مخصوص نہج فکر سے آشنا ہو گئے ہیں۔ اس تفسیر کے لکھنے میں گیان چند جین کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور سے قلم زد کلام کو، خود انھی کی زبانی ملاحظہ ہو:

> ''غالب کا قلم زد کلام اجنبی فارسی محاوروں کی جنت ہے۔ فارسی لغات کے بغیر ان اشعار کے حل کی سعی نا مشکور رہے گی۔ میں نے قدم قدم پر بہار عجم اور فرہنگ آنند راج کا سہارا لیا ہے۔...... لیکن یہ یاد رکھیے کہ غالب کے اشعار میں بعض ضروری اجزا کے حذف ہونے کی وجہ سے شاعر کے مافی الضمیر تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔''

(تفسیر غالب، گیان چند جین، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر۔ ۱۹۷۱، ص ۱۲)

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند جین کلام غالب کی تفسیر لکھتے وقت کن دشواریوں سے دو چار ہوئے تھے، باوجود اس کے ان کا اعتماد متزلزل نہیں ہوا۔ اس تفسیر کے دو حصے قابل توجہ ہیں۔ ایک تو وہ جسے امتیاز علی عرشی نے اپنے نسخے میں منتخب اشعار کو ''یادگار نالہ'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ اور دوسرا وہ حصہ جو غالب کے خود نوشت دیوان کے نئے اشعار کی تشریح کی

ہے۔اس حصہ میں ۱۶۹ اشعار شامل ہیں۔یادگارنالہ کی تشریح کے متعلق گیان چند جین نے لکھا ہے:

''یادگار نالہ کے اشعار کی ابھی تک تشریح نہیں لکھی گئی ہے۔ان میں بیشتر اشعار صاف ہیں صرف کہیں کہیں کوئی شعر وضاحت طلب ہے۔چوں کہ میری کتاب کا مقصد غالب کے تمام مشکل اشعار کی شرح فراہم کرنا ہے۔'' (ایضاً۔ص،۶۹۷)

گیان چند جین نے یادگار نامہ سے ۱۱۱۸ اشعار کی تشریح کی ہے۔جن میں پانچ قطعات، تین قصائد کے چند اشعار، دو مرثیہ سے کچھ اشعار، تین سہرے سے تین اشعار کے علاوہ ۱۸ غزلوں کے منتخب اشعار کی تفسیر شامل کتاب ہے۔گیان چند جین نے غالب کے قصیدے کے جن اشعار کی تشریح کی ہے پہلے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سن اے ندیم، برس گانٹھ کے، یہ تاگے نے | تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
پئے دعائے بقائے جناب فیض مآب | لگے گی اس ثواب کی استوار گرہ
ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے | بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ

درج بالا اشعار کی گیان چند جین نے جو تفسیر بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے:

''اے ہم نشیں برس گانٹھ کے تاگے نے گرہ کا شیوہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ فیاض راجہ کی بقا کی دعا کے لیے تسبیح ہزار دانہ بننا چاہتا ہے۔اس میں معمولی گرہیں نہیں لگیں گی بلکہ تاروں کی گرہ لگائی جائیں گی۔عموماً تسبیح سو دانوں کی ہوتی ہے لیکن یہ ہزار دانوں کی بنا چاہتا ہے تا کہ دعا زیادہ مؤثر ہو اس کے لیے ہزار گرہوں کی ضرورت ہوگی جو ہزار سال میں ممکن ہوگی۔ثوا اور گرہ (ہندی میں بمعنی سیارہ) میں رعایت ہے اور ثوا اور استوار کے لفظ میں بھی رعایت ہے۔سال گرہ کے تاگے کو تسبیح سال بھی کہتے ہیں۔'' (ایضاً۔ص۵۰۱)

یہاں گیان چند جین نے بہت حد تک اشعار کی تشریح کر دی ہے، اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ثوابت اور گرہ کو ہندی میں سیارہ کہتے ہیں۔لیکن یہاں ہزار دانوں کی تسبیح چاہتا ہے کہ بنے، کے تعلق سے لکھا ہے کہ ہزار دانوں کی تسبیح بنا چاہتا ہے۔''تسبیح بنا چاہتا ہے'' یہ جملہ بہت واضح نہیں ہے۔اسی طرح سے پہلے مصرع میں ''برس گانٹھ'' کی بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔جس طرح سے گیان چند جین نے!

عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو | کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ

میں پہلے جاذبہ کے معنی کو لکھا ہے، اس کے بعد اس شعر کی تفسیر چند جملوں میں لکھی ہے۔اسی طرح سے اگر قصیدے کے درج بالا اشعار کے مشکل الفاظ کے معنی کے ساتھ اشعار کی تفسیر لکھتے تو

یقیناً غالب فہمی کے باب میں ایک اہم اضافہ ہوتا۔لیکن ایسا کہیں کہیں ہے، ورنہ عام طور پر جین صاحب نے مشکل الفاظ کے معنی بھی لکھے ہیں۔اسی طرح سے غالب کی ایسی رباعی ہے جسے پڑھ کران کے شیعہ ہونے پر بھی شبہ ہوتا ہے۔رباعی ملاحظہ ہو:

یاران رسول یعنی اصحاب کبار ہیں گر چہ بہت، خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار غالب، وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ چاروں خلیفہ میں سے کسی ایک کا بھی انکار کیا تو وہ مسلمان نہیں۔اس رباعی میں غالب نے یہ کہا ہے کہ یوں اصحاب رسول بہت ہیں، لیکن خلیفہ ان میں چار ہی ہیں۔آگے یہ کہتے ہیں کہ ان چار میں ایک سے کسی نے بھی انکار کیا تو وہ مسلم نہیں رہا۔یہاں غالب یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ ان چار میں سے ایک سے بھی ہو جسے انکار۔بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ' ان چار میں ایک سے' جس کو انکار ہو وہ مسلم نہیں۔وہ ایک سے مراد بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔اس شعر کی تشریح گیان چند جین کی زبانی ملاحظہ ہو:

''صرف تیسرے مصرعہ کی ایک نہفتہ شوخی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے بہ ظاہر اس مصرع اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ'' چاروں خلفا میں سے کسی ایک سے بھی کوئی انکار کرے تو وہ مسلمان نہیں۔''لیکن غالب نے ایک یہ پہلو بھی ذہن میں رکھا ہے''ان چاروں خلفا میں سے صرف ایک یعنی حضرت علی ایسے ہیں کہ کوئی ان سے انکار کرے تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔'' (ایضاً ۵٦٦)

گیان چند جین ایک محقق تھے، ان کا ذہن نئی نئی چیزوں کو ڈھونڈھنے میں لگا رہتا تھا۔اس کا ثبوت غالب کے ایک شعر کی تشرح میں بھی انھوں نے دیا ہے۔پہلے وہ شعر ملاحظہ ہو:

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد زور نسبت مے کسے رکھتا ہے، نصارا کا نمک

اس شعر میں ''نصارا کا نمک'' سے کیا مراد ہے واضح نہیں۔اس کی وضاحت گیان چند جین نے مالک رام اور قاضی عبدالودود سے چاہی تو ان دونوں نے اس کے معنی سے لاعلمی کا اظہار کیا۔اس کے بعد امتیاز علی عرشی کو اس متعلق لکھا تو انھوں نے جو تشریح بھیجی پہلے وہ ملاحظہ ہو

:''نصارا کا نمک سے مراد وہ پنشن ہے جو غالب کو ملا کرتی تھی وہ بہت مختصر تھی اس لیے غالب کے لیے ناممکن تھا کہ اس سے مے نوشی کا خاطر خواہ سامان کر سکیں تو گویا

نصارا کا نمک جو یہ کھاتے تھے وہ بجائے لذت عیش کو بڑھانے کے وہ کام کرتا تھا جو شراب میں نمک ڈالنے سے ہو جاتا ہے یعنی اس سے شراب کا سکر (نشہ) ختم ہو جاتا ہے اور وہ سرکے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔" (ایضاً ص۔۲۳۸)

اب اس تشریح سے کوئی بھی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اس کی دو وجہ ہے۔ ایک تو امتیاز علی عرشی اس کے شارح ہیں دوسرے یہ کہ جو تشریح کی ہے اسے ذہن بھی قبول کرتا ہے۔ لیکن گیان چند جین اس تشریح میں تھوڑی سی قباحت ظاہر کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ شعر نسخۂ بھوپال کا ہے۔ یعنی ۱۸۲۱ سے پہلے کا شعر ہے اور اس وقت تک غالب کو انگریزوں سے براہ راست پنشن نہیں ملتی تھی۔ ان کی آمدنی کے کئی ذرائع تھے۔ اس لیے بہت شبہ ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کی نمک خواری کا شکوہ کریں۔ اب اس شعر کی تشریح گیان چند جین کی زبانی ملاحظہ ہو:

"نصارا کا نمک سے مراد عیسائی حسیناؤں کا نمک حسن ہے۔ غالب نے بعد میں کلکتہ میں تو میموں کے حسن پر بڑی للچائی نظر ڈالی ہے جیسا کہ ان کی فارسی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے۔ یقینی ہے کہ دہلی میں بھی کچھ انگریز حسینائیں دیکھی ہوں گی۔ قباحت یہ ہے کہ ان کے حسن صبیح میں ملاحت کہاں۔ بہر حال مے نوشی کے عمل میں مجھے لذت نہیں ملتی تاوقتیکہ کوئی نمکین نقل ساتھ نہ ہو۔ نمک حسینان نصارا کا نقل شراب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہ نمک مے نوشی کا ساتھ دینے کو میسر آجائیں تو عیش کی لذت مل جائے۔" (ایضاً ص ۲۳۸)

درج بالا دونوں تشریح مایہ ناز محققین کی ہیں۔ تشریح کی حد تک دونوں اپنی اپنی جگہ درست بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس شعر کو زمانے کے تعین کے ساتھ جب تشریح کی گئی تو معنی اور مطلب دونوں بدل گئے۔ اور یہی گیان چند جین کی خوبی ہے کہ وہ تحقیق کا کوئی بھی دقیقہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسی طرح کی بے شمار ایسی مثالیں ہیں جو "تفسیر غالب" میں بھری پڑی ہیں۔ مختصر یہ کہ گیان چند جین اس تفسیر سے خود کو غالب شناس کی فہرست میں کھڑے پاتے ہیں۔ گیان چند جین نے غالب کے کلام کی کیف آور صہبا کو اپنی نکتہ آفرینیوں سے غالب کے شیدائیوں کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ تفسیر غالب کے ذریعہ گیان چند جین نے غالب شناسی کے نگار خانے میں بصیرت کی ایک نئی اور رنگین شعاع کا اضافہ کیا ہے۔

❀❀❀

ڈاکٹر عقیل احمد

شیخ ابراہیم ذوق کی زبان

ذوق کی پیدائش کا سال 1789ء ہے۔ یہ دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا تھا۔ لیکن اردو شاعری اور زبان کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اردو میں میر، سودا، خواجہ میر درد جیسے باکمال شاعر اردو شاعری کے افق پر نمودار ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ لال قلعہ میں شعر و شاعری کا ماحول عروج پر تھا۔ اسی دور میں مومن اور غالب بھی آتے ہیں۔ ذوق کی جب بات ہوگی تو ضمناً ہی سہی معاصرین کی بات بھی ہوگی۔ غالب کو مشکل پسند کہا جاتا ہے مومن کو خالص عشقیہ مضامین کا شاعر اور ذوق کو زبان کا شاعر کہنا چاہیے۔

غالب مشکل پسند تھے ان کے برعکس دہلی والی آسان زبان کی طرف مائل تھے۔ مرزا غالب کے سسر الٰہی بخش خاں معروف شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ وہ سلیس اور صاف روزمرہ لکھتے تھے۔ مومن، ذوق، شیفتہ اور آزردہ مشکل پسندی سے بچتے تھے غالب نے بھی ان کی صحبت میں کسی حد تک ان کی پیروی کی۔ ذوق اور غالب کی چشمک مشہور ہے بلکہ یہ شعر بہت مشہور ہے جو غالب نے ذوق کے لیے کہا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ذوق دہلی والوں کے شعری مذاق پر چھائے ہوئے تھے۔ محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر ان کے دوست تھے۔ ذوق کے کلام کی فصاحت کی شاہی دربار میں قدر کی جاتی تھی۔ ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں قلعے میں شعر و شاعری کا ماحول تھا وہ شعاع تخلص رکھتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے فرزند ابوظفر نوجوانی میں ہی شعر کہنے لگے۔ اس وقت شاہ نصیر کا سکہ چلتا تھا۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف وقوافی میں شاعری ہو رہی تھی، چست ترکیبوں، اچھوتی

تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے ان کا رنگ سب پر چڑھا ہوا تھا۔

ذوق کو کم عمری میں ہی قلعہ معلیٰ میں داخلہ مل گیا تھا۔ ذوق میر کاظم حسین بے قرار کے توسط سے قلعے میں جانے لگے تھے۔ اس وقت ان کی عمر انیس بیس سال تھی۔ خالص دہلی والے تھے زبان صاف ستھری محاوروں پر ہوتی تھی۔ قلعے میں ان کی حاضری شہزادہ ابوظفر کے یہاں ہوتی تھی۔ ان کی چار روپے تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ ذوق دھیرے دھیرے اکبر شاہ ثانی کے یہاں جانے لگے۔ انھوں نے بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا چند اشعار تشبیب کے۔

سحر جو گھر میں بہ شکل آئینہ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں　　تو اک پری چہرہ حور طلعت بہ شکل بلقیس و ماہ کنعاں

پری کی صورت چمن کی زنگت گر اس کا شیوہ تو اس کا جلوہ　　زبان شیریں، بیان رنگیں کلام رنداں خرام مستاں

اتنی سلیس زبان میں قصیدہ لکھنا خود اپنے آپ میں کمال ہے۔ دس اشعار کی تشبیب میں بھی ذوق اپنے ممدوح کی تعریف ہی تعریف بیان کرتے ہیں اور آخری شعر میں کہتے ہیں۔

جو نام پوچھا کہا خوشی ہوں جو وصف پوچھا تو دلبری ہوں
سبب جو پوچھا تو ہنس کے بولا کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں

پھر اصل مدعا پہ آتے ہیں۔

وہ شاہ ہے جو ہے شاہ اکبر، جہاں میں رشکِ جم و سکندر　　جلوس جشن اس کا ہے فلک پر، اسی کے پرتو ہیں آسماں پر

یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت لکھا وہ مطلع شفق شباہت　　کہ جس کو احسن کہے سخن در پڑھے بہ تحسیں ہر اک سخن داں

اس کے بعد مدح سرائی ہوتی ہے اور آخر میں دعائیہ اشعار پر قصیدہ ختم ہوتا ہے۔

اسی اکبر شاہ ثانی نے انھیں خاقانی ہند کے خطاب سے نوازا۔ جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے ذوق کی تنخواہ تیس روپیے سے سو روپیے کر دی گئی اور انھیں سلطان الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ ان کی زندگی آسودہ تھی۔ بادشاہ کو خوش رکھنا اور اشعار پہ داد لینا ان کا مقصد حیات تھا۔ زندگی میں کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ وفا شعار بیوی بڑے سلیقے سے گھر چلاتی تھیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں شیخ ابراہیم ذوق کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے غالب اور آہنگ غالب میں لکھتے ہیں:

''ذوق کو جذبے کی شدت سے اپنی عمر میں کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ وہ نیک تھے اس لیے وہ بد ہو ہی نہیں سکتے تھے ان کے مزاج اور سیرت کی طرح ان کا ذہن بھی اوسط درجے کا تھا جس کا پرتو ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنی معاشرتی زندگی کی طرح اپنی شاعری میں محاورہ اور روزمرہ برتنے میں کامیاب رہے۔ لیکن ان کی معمولی صلاحیت کے ذہن سے کسی بڑے تخلیقی کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی ان کی شاعری بنیادی حیثیت سے جذبات کے اظہار کا وسیلہ نہ تھا بلکہ زبان کے کرتب دکھانے کا آرٹ تھا''

درج بالا عبارت غالب اور ذوق کے تناظر میں لکھی گئی ہے۔ ان صفات کا ذکر کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ شیخ ابراہیم ذوق ایک عام شاعر تھے۔ اس عبارت میں سب سے اہم جو بات ہے وہ ان کی زبان ہے۔ وہ اپنی معاشرتی زندگی کی طرح اپنی شاعری میں محاورہ اور روزمرہ برتنے میں کامیاب رہے۔ یہ ذوق کی شاعری کا ایسا وصف ہے جس کا فیضان آج تک جاری ہے۔ استادی اور شاگردی کا جو سلسلہ ان سے قائم ہوا وہ آج بھی رائج ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اپنی کتاب ذوق: سوانح اور انتقاد میں لکھتے ہیں:

''ذوق نے زبان کی اصلاح و درستی کے سلسلے میں جو کام کیا اس کی نوعیت وہی ہے جو ناسخ کی خدمات زبان و ادب کی ہے جس کا مقصد زبان و ادب کو ابتذال سے پاک کرنا اور انتشار سے بچانا تھا اس بارۂ خاص میں ذوق کا اپنا امتیازی وصف اور ایک انفرادی نہج ہے۔ ناسخ نے اپنی اصول پرستی کے تحت زبان کو جن دستوری پابندیوں میں جکڑ دیا تھا اس کی وجہ سے وہ عام بول چال کی زبان سے دور اور لطف و شیرینی سے محروم ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس ذوق نے اپنی ضابطہ پسندی اور سعی اصلاح و آراستگی کے باوصف زبان کے فطری لوچ اور لچک کا لحاظ رکھا۔۔۔۔ انھوں نے سادگی اور

صفائی پر بہت زور دیا ہے اور ہندی الفاظ کو اس قدر برمحل استعمال کیا ہے کہ
بول چال کے بے شمار الفاظ محاورات جو ادب میں حقیر و بے وقعت سمجھے
جاتے تھے جزو زبان بن کر بے تکلف استعمال ہونے لگے۔''

ذوق کے کلام سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں ذوق نے ردیف اور قافیے میں ہندی حروف کا استعمال کر کے محاروے استعمال کئے ہیں اس فن میں وہ اپنے معاصرین میں سب سے الگ ہیں۔ ایک غزل میں ''دو گھڑی کے بعد'' بطور ردیف استعمال کیا ہے اور اس غزل میں قافیہ گھڑی، اڑی، جھڑی، کڑی، دھڑی، پڑی، بڑی، لڑی جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ غزل میں گیارہ اشعار ہیں۔ لفظ گھڑی کو تین بار قافیے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جھڑی بطور قافیہ دوبار استعمال ہوا ہے۔ کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

یہاں معشوق کا انتظار ہو رہا ہے کہ عاشق معشوق کا چہرہ دیکھ کر دم توڑے اور جب تک وہ نہ آئے سینے میں اس کی سانس رکی رہے اور جب وہ آجائے تو سانس نکل جائے۔

کیا روکا اپنے گریے کو ہم نے کہ لگ گئی اب پھر وہ آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

عاشق نے اپنی آہ وزاری پر ضبط تو کرلیا لیکن دو گھڑی کے بعد وہ گریہ وآہ زاری آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہو گئے اور آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے لگے جیسے برسات میں مسلسل بارش ہونے لگتی ہے۔

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

اس شعر میں معشوق کی سخت کلامی اور برہمی کا ذکر ہے۔ اگر کسی وقت معشوق نے کچھ رحم کیا اور نرم لہجہ اختیار کیا تو یہ کیفیت لمحاتی ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناراضگی کی کوئی اور کڑی لے کے بیٹھ جائے گا۔ کڑی یہاں سلسلہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس زمین میں ذوق نے بڑے پر لطف اشعار نکالے ہیں۔ اگلے شعر میں وہ کہتے ہیں۔

کل ہم نے اس سے ترک ملاقات کی تو کیا پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

کل نہ پڑنا بے چین رہنا محاورہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اس لعل لب کے لے لیے بوسے کچھ اس قدر　　سب اڑ گئی مستی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اس شعر میں الفاظ کی بازی گری دیکھیے۔

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے　　وہ ساری شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

شیخ جی اور شیخی جیسے الفاظ یہاں لطف دے رہی ہیں۔ جھڑی یہاں ختم ہونے کے معنی استعمال ہوا ہے۔ ذوق کے دیوان میں دو غزلیں اور ہیں جن کی ردیف ''تو کیا پتھر تھے'' ہے ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے۔

مر کے بھی چھاتی پہ پتھر رہا کیا خاک ہو خوش　　کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

اس غزل کا مطلع بھی دیکھیے۔

سنگدل ہیں گے وہ اے ذوق سدا حق میں مرے　　غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

ذوق نے اردو میں صرف سادگی اور دیسی الفاظ کے استعمال پر ہی توجہ نہیں دی بلکہ انھوں نے اپنی شاعری میں عربی فارسی الفاظ و اصطلاحات کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔ جیسے

پوچھے دہان زخم جگر سے کوئی مرے　　کیسا خدنگ یار ہے جوں نیشکر لذیذ

شمع ساں آہ نہیں میری شرر بار فراق　　سرد مہری سے تری گرم ہے بازارِ فراق

لوگ کس طرح سے جانیں مجھے نخچیر فراق　　دل مرا رہتا ہے ہر دم ہدفِ تیر فراق

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض　　ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض

اردو زبان کی تشکیل میں عربی فارسی کے علاوہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں کا بھی اہم کردار رہا ہے ذوق نے شعری سطح پر اسے برتنے کی کوشش کی اسی وجہ سے انوارالحسن صدیقی دیوان ذوق میں لکھتے ہیں کہ ذوق زبان کی شاعری کا باوا آدم ہے۔ اگر غالب نے اردو شاعری کو معنی آفرینی سے مالا مال کیا تو ذوق نے زبان کا وہ نمونہ پیش کیا جسے آج بھی برتا جا رہا ہے۔

❁❁❁

نند کشور وکرم

گوربچن چندن

ادیب، صحافی اور افسانہ نگار گربچن کو مَیں کوئی نصف صدی سے جانتا ہوں اور اس دوران مجھے اُن سے کئی بار ملاقات کا ہی شرف حاصل نہیں ہوا بلکہ چند بار ہم ایک دوسرے کے گھر بھی گئے۔ بعد ازاں میرا تبادلہ پریس انفارمیشن بیورو ہو گیا اور مجھے ان کی سرپرستی میں کچھ مدت تک کام کرنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اسی عرصہ ملازمت کے دوران مَیں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی کے کئی پہلوؤں سے روشناس ہوا۔ اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی ادبی اور صحافتی زندگی میں ہمیشہ بڑی محنت و جانفشانی سے کام کرتے رہے، خصوصاً پریس انفارمیشن سے سبکدوشی کے بعد تو وہ پوری لگن سے صحافتِ اردو کی تاریخ کو کھنگالنے میں مصروف ہو گئے اور دن رات کی محنت شاقہ سے انہوں نے ہمیں کئی نئے گوشوں سے روشناس کیا، جن سے پہلے ہم واقف نہیں تھے۔ خصوصاً مولوی محمد باقر اور اُردو کے پہلے اخبار ''جامِ جہاں نما'' سے متعلق اُن کی دریافت نے انہیں تاریخ صحافت میں ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ تاریخ صحافت میں انہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

چندن صاحب کی ولادت لاہور کے ایک نواحی قصبے باغبان پورہ میں ۸/اکتوبر۱۹۲۲ء کو ہوئی تھی اور والدین نے اُن کا نام گوربچن داس رکھا مگر وہ ادب وصحافت میں گوربچن چندن کے نام سے اور دفتر میں عام طور پر جی، ڈی، چندن کے نام سے موسوم کیے جانے لگے۔ اُن کے والد ایشور داس نے اُن کی تعلیم و تربیت میں ذاتی دلچسپی دکھائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسکول کے ذہین طلبا میں شمار ہوتے رہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے لٹریچر میں ڈگری حاصل کی جسے اُس دور میں اعلیٰ ترین ڈگری مانا جاتا تھا

اور شاذ و نادر ہی لوگ اس تعلیمی مقام تک پہنچ پاتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب عام طور پر لوگ بڑی مشکل سے میٹرک تک کی ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے اور اُسے ہی بہت پڑھا لکھا شخص سمجھا جاتا تھا۔

چندن صاحب کی سوانحی کوائف کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم پر آشکار ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے صحافتی سفر کا آغاز اگست ۱۹۴۲ء میں کیا تھا جبکہ مہاتما گاندھی کے بمبئی ریزولیشن ''انگریزو ہندوستان چھوڑو'' سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کے اشتراک سے قصبے سے ''باغبانپورہ کی آواز'' نامی ایک قلمی اخبار نکالا تھا جو کہ انگریزی سرکار کے خلاف ایک باغیانہ سرگرمی کے علاوہ اُردو صحافت میں اُن کا پہلا قدم تھا۔ اس لحاظ سے وہ صحافتی سفر میں کوئی سات دہے سے زائد مدت تک مسلسل گامزن رہے۔ اسی اخبار کی وساطت سے انہوں نے تحریکِ آزادی میں بھی اپنے حسبِ توفیق حصہ لیا اور پولیس کے عتاب کا نشانہ بھی بنے۔

تحریک آزادی میں حصہ لینے اور ''باغبان پورہ کی آواز'' کو قلمی صورت میں پیش کرنے کے متعلق انہوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مشہور مجاہدِ آزادی میاں افتخار الدین بھی باغبانپورہ کے رہنے والے تھے اور انہوں نے اس قصبے میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کی تھی جس کا افتتاح خان عبدالغفار خاں نے کیا تھا۔ جس میں انہوں نے بھی شرکت کی تھے۔ بقول اُن کے:

> ''مَیں ان دنوں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اور اس جلسے کا اشتہار پڑھ کر میاں افتخارالدین سے جن کے والد ہمارے خاندان کے پرانے دوست تھے، ملا اور جلسے میں اقبال کا قومی ترانہ ٴہندی سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کی اجازت دے دی۔
>
> وہ جلسہ باغبان پورہ کی سیاسی زندگی کا افتتاح تو تھا ہی میرے جذبہ ٴحریت کے اظہار کا آغاز بھی بن گیا۔ وہاں ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کا ترانہ سُنا کر مجھے کتنا سرور آیا، اُس کی یاد سے آج بھی میرا سارا وجود کسی ساز کی طرح جھنجھنانے لگتا ہے۔''

بعدازاں جب اگست ۱۹۴۲ میں مہاتما گاندھی نے بمبئی کے آزاد میدان میں 'انگریزو ہندوستان چھوڑو' کا ریزولیشن پاس کیا اور ملک بھر میں برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کی ایک لہر دوڑ گئی اور ملک کے لاکھوں نوجوان اس تحریک میں کود پڑے۔تب ملک میں قومی رہنماؤں کی گرفتاریوں پر دوسرے نوجوانوں کی طرح چندن صاحب کے دل میں بھی جذبہ آزادی جوش مارنے لگا اور انہوں نے کچھ نوجوان ساتھیوں کے ساتھ مل کر مذکورہ بالا قلمی اخبار 'باغبانپورہ کی آواز' نکالا جو انگریزی سامراج کا مخالف اور نیتا جی سبھاش چندر بوس اور اُن کی آزاد ہند فوج کا حامی تھا۔اس اخبار کی بارے میں چندن صاحب نے اپنے مضمون ۔''۱۹۴۲ء کا ایک ورق'' میں یوں لکھا ہے:

> ''اخبار کی تحریر، تشکیل، ترتیب اور یہاں تک کہ کتابت بھی میرے ہاتھ میں ہوتی تھی۔اس کی تقسیم گروپ کے دوسرے ممبروں کے ذریعہ نہایت خفیہ انداز سے کی جاتی تھی۔سنیچر کی رات بلکہ نصف رات کو اس کے پرچے بستی کے چوکوں میں چسپاں کر دیئے جاتے تھے یا لوگوں کے لیٹر بکسوں میں ڈال دئے جاتے تھے۔لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی! ۱۹۴۲ء کی ۹ اگست کو لاہور کی اسپیشل پولیس کے ایک دستے نے میرے گھر پر چھاپہ مارا اور میرے تمام کاغذات کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ان میں ''باغبانپورہ کی آواز'' کے کئی شمارے شامل تھے۔مَیں دن بھر اپنے گھر میں اُن کے گرفت میں رہا اور شام کو گھر سے اُٹھا کر لاہور کی پرانی انارکلی کے تھانے کے حوالات میں ڈال دیا گیا۔''

مگر بڑی حیرانی کی بات ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد انہوں نے بحیثیت مجاہدِ آزادی کوئی تامر پتر، پنشن یا دیگر مراعات پانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی حالانکہ حصولِ آزادی کے بعد بہت سے لوگوں نے جھوٹے اور جعلی سرٹیفکیٹ پیش کر کے بطور مجاہدِ آزادی پنشنیں اور دیگر مراعات حاصل کیں ۔شاید چندن صاحب نے بوجوہ ان مراعات کو قبول کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

باغبانپورہ کی آواز'' سے اپنے صحافتی سفر کی ابتدا کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۴۵ء میں اس وقت کے مشہور انگریزی روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور میں بحیثیت سب ایڈیٹر کام شروع کیا۔

پھر صحافت میں دلچسپی اور اس سے وابستگی کے ارادے کے مدِ نظر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے صحافت میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا تا کہ اس میدان میں انہیں مزید پختگی و تجربہ حاصل ہو سکے۔ بٹوارے سے کچھ مدت پہلے انہوں نے ایک اُردو ہفت روزہ ''ساگر'' کی ادارت بھی کی تھی جو بہت مختصر مدت کے لئے تھی مگر یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مذکورہ اخبار اُن کا نجی اخبار تھا یا کسی اور کے اخبار کی وہ ادارت کر رہے تھے۔ بہر حال اس اخبار کی شروعات کے کچھ مدت بعد برصغیر کی تقسیم کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوگیا اور وہ اپنے پریوار کے ساتھ دہلی آگئے۔

بٹوارے کے بعد انہیں قومی تحریک سے وابستگی اور صحافتی تجربے کی بنا پر کانگریس پارٹی کے ترجمان ''نیشنل کانگریس ویکلی'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن یہ تقرر بھی چند ماہ تک ہی محدود رہا کیوں کہ ۱۹۴۸ء میں ان کا تقرر حکومت ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات میں ہوگیا اور وہ کچھ عرصہ پریس انفارمیشن بیورو کے سب آفس جالندھر میں خدمات انجام دینے کے بعد مستقلاً دہلی آگئے اور بقیہ عرصہ انہوں نے شاستری بھون میں واقع پریس انفارمیشن بیورو میں ہی گزارا جہاں انہیں جگن ناتھ آزاد، علی جواد زیدی، شمشیر سنگھ نرولا ایسی معرف ادبی ہستیوں کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا۔ پھر یہیں سے بتیس برس کی ملازمت کے بعد وہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو نفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اکثر حضرات بقیہ زندگی آرام و کاہلی کی نذر کر دیتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ سبکدوشی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اب ناکارہ و بیکار ہو کے رہ گئے ہیں تبھی تو انہیں ملازمت سے ہمیشہ کے لئے چھٹی دے دی گئی۔ مگر چندن صاحب نے سبکدوشی کے بعد آرام و سستی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا اور انہوں نے اپنے وقت کا لمحہ لمحہ صحافتی تحقیق وجستجو کی نذر کر دیا۔ ان میں ایک نئی قوت اور نوجوانوں کی سی تیزی وطراری آگئی تھی اور وہ ہر وقت اخبارات وجرائد سے متعلق مواد اکٹھا کرنے میں منہمک رہے۔ کبھی وہ نیشنل آرکائیوز میں بیٹھے نظر آتے تو کبھی کسی اُردو ادارے یا اکادمی کی لائبریری میں کتابوں کی تلاش وسرگردانی میں مصروف نظر آتے اور کبھی صحافت سے متعلق کسی شخصیت سے جانکاری اور معلومات اکٹھا کرنے کے لئے وہ اُن کی قیام گاہ تک پہنچتے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ کچھ کتابوں سے متعلق جانکاری کے سلسلے میں راقم کے ہاں بھی آئے تھے۔ اس

طرح انہوں نے اپنی سبکدوشی کے ۳۵ سال کے طویل عرصے میں اتنا تحقیقی کام انجام دیا جسے دیکھ کر آدمی حیرت واستعجاب میں ڈوب کے رہ جاتا ہے۔ ان کے صحافتی انکشاف کے پیشِ نظر ہی اُردو ناقد وصحافی ظ۔ انصاری نے انہیں اُردو صحافت کی نہایت ''باخبر قبلہ'' کہا تھا۔

چندن صاحب نے یوں تو صحافت میں کئی کتابچے اور کتابیں پیش کیں جن کی تحقیقی کاوش میں سے ''جامِ جہاں نما: اُردو صحافت کی ابتدا'' اور ''اُردو صحافت کا سفر'' کی صحافتی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ جامِ جہاں نما کی اشاعت سے پیشتر محققین نے اُردو کے اس پہلے اخبار کے بارے میں مختلف آراء سے بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا جیسے یہ کہ یہ اخبار اُردو کا پہلا اخبار نہیں ہے یا یہ کہ مذکورہ اخبار برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک سرکاری یا غیر سرکاری گزٹ تھا۔ جو فرنگی افسروں کی تعلیم وتربیت کی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ ان تمام امور پر چندن صاحب نے پہلی بار سنجیدگی اور تندہی سے تحقیق کی اور دن رات ایک کر کے اس سلسلے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، اور دیگر مستند ذرائع سے حقائق کو اکٹھا کر کے اور برسوں کی محنتِ شاقہ سے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ اس سلسلے میں کس طرح کی محققین نے غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ اور درحقیت سچائی کیا ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جامِ جہاں نما کے بارے میں مروجہ نظریات حقیقت سے بعید ہیں۔ بقول چندن صاحب:

> ''یہ امر حیرت ناک ہے کہ ہمارے اس اولین اخبار سے جو تقریباً ساٹھ سال تک جاری رہا۔ اور جو اجراء کے چھ سال بعد ہی صاحب مطبع اور کمپنی کے نشان سے آزاد بھی ہوگیا، آج تک انصاف نہیں کیا گیا۔ بلکہ ستم ہے کہ اسے ایک بے وقعت طفیلی اور کاسہ لیس اخبار کا درجہ دے کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اخبار جس سے ہندوستان کے گوشے گوشے کے اخباروں، مشاہدوں اور مبصروں نے استفادہ کیا تھا، اور جسے حکومت کے ایک سیکرٹری نے اپنے وقت کا ''بہترین محتاط اور ذی فہم'' اخبار قرار دیا تھا اپنے مورخوں کے ہاتھوں اُردو کا مظلوم ترین اخبار بن گیا''

چندن صاحب آگے لکھتے ہیں۔

''اس اخبار سے عدم توجہی یا نیم توجہی کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کے

مالک اور اڈیٹر کے بارے میں پوری معلومات دستیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ راقم الحروف نے ان کی فراہمی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ دستیاب ریکارڈ کی کھوج لگائی۔ اخباروں میں اشتہار چھپوائے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی اور تحقیقی کتاب تو ختم ہو جاتی ہے مگر اس کے موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔''

جہاں تک چندن صاحب کی تصانیف کا تعلق ہے ۱۹۸۶ء میں اُن کا ایک کتابچہ بعنوان ''اُردو صحافت پر ایک نظر'' اُردو اکادمی دہلی نے شائع کیا تھا جس میں ابتدا سے ۱۹۸۲ء تک کی تاریخِ صحافت کا مختصر جائزہ لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں اُن کی معروف تحقیقی کتاب ''جامِ جہاں نما'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کی جس کی صحافتی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ پھر ۱۹۹۶ء میں انہوں نے بزرگ صحافی جمنا داس اختر پر ایک کتاب ''جمنا داس اختر: شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات'' مرتب کی جس میں اُن کی شخصیت اور اُن کی پون صدی کی سرگرمیوں اور پنجاب کی صحافت کا جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ کتاب چندن صاحب نے ماہنامہ کتاب نما'' کے خصوصی شمارے کے مہمان مدیر کی حیثیت سے مرتب کی تھی۔ علاوہ ازیں انہوں نے اُردو صحافت کی ابتداء وارتقا کے بارے میں ایک تاریخی مقالہ بھی لکھا تھا جسے قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نے اُردو انسائیکلوپیڈیا میں شامل کیا تھا۔ ان کے علاوہ انہوں نے اُردو اخبارات و رسائل میں ایک سو سے زائد مضامین اور فیچر لکھے۔ اور آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے کئی صحافت سے متعلق پروگراموں میں بھی شرکت کی۔ صحافت سے متعلق کئے گئے اُن کے تحقیقی کام کی پذیرائی بھی تمام صحافتی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی طور پر ہوئی، اور اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کئی اداروں اور اکادمیوں کی جانب سے انہیں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ اُن کی تحقیقی کتاب ''جامِ جہاں نما۔ اُردو صحافت کی ابتداء'' پر دہلی اور اُتر پردیش اکادمیوں نے انہیں ۱۹۹۲ء کی منتخب کتابوں کے زمرے میں انعامات سے نوازا۔ اسی طرح دہلی اُردو اکادمی نے آزادی کے گولڈن جوبلی سال، ۱۹۹۷ء میں انہیں، اُردو صحافت پر خصوصی اعزاز سے نوازا۔

اُن کے تحقیقی کاموں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پریس کونسل آف انڈیا اور راشٹر پتی کے سیکرٹریٹ نے ہندوستان میں اُردو پریس پر مشاورت کے سلسلے میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔ وہ نیشنل

کونسل برائے فروغِ اردو زبانِ اُردو کی ماس میڈیا پینل کے چئیر مین بھی رہے اور مذکورہ کونسل کی اصطلاح ساز کمیٹی کے سربراہ بھی، جس کے نتائج پر مذکورہ کونسل نے ایک فرہنگ تیار کی تھی یہی نہیں ان کی تحقیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی پاکستان نے انہیں اُردو صحافت میں داخل ہونے والے پی ایچ ڈی کے مقالوں کا ممتحن بھی مقرر کیا تھا۔

اُن کی صحافتی خدمات کا اعتراف اجتمائی اور انفرادی سطح پر کیا گیا ہے اور صحافت سے متعلق کئی معلوماتی اور تحقیقی حوالے کے طور پر اُن کے مضامین و مقالوں سے بہت سی انجمنوں اور اداروں نے استفادہ کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے انڈین لٹریچر کے انسائکلو پیڈیا میں اُردو صحافت سے سے متعلق ایک پورا باب انہیں کا تحریر کردہ ہے جو اُن کی محنت شاقہ کا آئینہ دار ہے۔

چندن صاحب کی بدولت صحافتی تحقیق سے متعلق ہمارے سامنے بہت سی نئے انکشافات ہمارے سامنے آئے۔ جیسے یہ کہ دنیا کی کسی بھی زبان سے پیشتر اُردو زبان میں ہی نیوز پیپر (NEWS PAPER) کے لئے لفظ ''اخبار'' استعمال کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ پہلا پریس ایکٹ ''اُردو فارسی کے اولین اخبار'' جام جہاں نما'' کی تحریروں پر قدغن لگانے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے آرکائیوز سے حاصل کردہ مذکورہ چھ شماروں کے مطالعہ کا حوالہ دیا ہے جس میں لکھا گیا کہ ایکٹ نہ بنانے کی صورت میں یہ اخبار سنگین شرانگیزی کا انجن بن سکتا ہے۔ چندن صاحب نے اپنے ایک مضمون میں یہ بھی بتایا ہے کہ مولانا آزاد کے اخبار ''الہلال'' پر ۱۹۱۲ء میں پابندی الہ آباد کے معروف انگریزی اخبار پینیئر (Poineer) کے ایک اداریے کی بنا پر لگائی گئی تھی۔

جام جہاں نما کے علاوہ اُن کی تحقیقی کتاب ''اُردو صحافت کا سفر'' میں شامل کئی مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسے...... اولین صحافی مولوی محمد باقر اور ۱۸۵۷ء کا عہد...... برصغیر میں اُردو صحافت کی ابتدا...... مولانا آزاد کا الہلال کیوں بند ہوا؟ تحریک آزادی میں اُردو صحافت کا حصہ وغیرہ۔

چندن صاحب سے ایک ملاقات کے دوران اُن کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی میرے سامنے آیا کہ وہ موسیقی سننے میں بھی بڑی رغبت رکھتے ہیں۔ اُس دور میں جب ریشماں کو پاکستان ریڈیو لاہور نے دریافت کرنے کے بعد ایک پروگرام ''یہ ریشماں کی آواز ہے'' پیش کیا تھا تو گفتگو کے

دوران چندن صاحب نے ریشماں کے پروگرام کی اتنی تعریف کی کہ اُس پروگرام سے محظوظ ہونے کے لئے میں خصوصی طور پر اُن کی رہائش گاہ پر گیا تھا کیونکہ اس کی آڈیو کیسٹ اُن کے پاس موجود تھی۔ گو ریڈیو سے ریکارڈ ہونے کی وجہ سے آواز صاف نہیں تھی تاہم اسے سُن کر مَیں صرف محظوظ ہی نہیں ہوا بلکہ اس کا گرویدہ بھی ہوگیا۔

چندن صاحب نے ملازمت کے دوران اور بعد میں فیچر اور کئی افسانے تحریر کیے جنہیں ادبی حلقوں میں بڑا سراہا گیا۔ مقامِ افسوس ہے کہ اُن کے افسانوی سفر پر کسی نے قلم نہیں اُٹھایا اور انہیں صرف صحافی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میدانِ صحافت میں اپنی تحقیق وجستجو کی بدولت وہ ایک اہم مقام پر پہنچے تھے مگر ابتدائی دور میں وہ افسانہ نویسی ہی کرتے رہے اور اُنہوں نے کئی افسانے قلمبند کیے۔ ان کا ایک افسانہ ''ناسور'' ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں سماجی مجلسوں اور محفلوں میں قنوطیت بانٹنے والے چھٹے کالم کا کردار پیش کیا گیا تھا۔ اسی سال انہوں نے ایک ڈرامائی فیچر ''ہیون سانگ کا خط ماؤزے تنگ کے نام'' سے پیش کیا تھا جو ۱۹۶۲ء میں ہندوستان چین کی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں انہوں نے ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والے معاہدہ کے موقع پر ایک افسانہ ''نئی صبح'' قلمبند کیا تھا جس میں نئے مستقبل کا پیغام دیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ اُن کے کئی افسانے ماہنامہ آج کل نئی دہلی میں بھی شائع ہوئے جیسے مجرم (جنوری ۱۹۶۴ء)۔ پیاس نہیں بجھتی (نومبر ۱۹۵۹ء)، نئی صبح (ستمبر ۱۹۶۵ء) اور ایک اور سفر (جولائی ۱۹۷۵ء)۔ اُن کا آخر الذکر افسانہ جہیز کی لعنت کے خلاف اور خواتین کے عالمی سال کے موقع پر اشاعت پذیر ہوا تھا اور جسے قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔ مگر افسوس کہ چندن صاحب نے اپنے افسانوں کی اشاعت کی جانب کوئی توجہ نہیں دی لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی ادارہ، اکادمی یا فرد اُن کے افسانوں اور کچھ تحقیقی مضامین کو اشاعت کا جامہ پہنانے کا قدم اُٹھائے تاکہ مستقبل کا محقق اُن کی ادبی اور صحافتی خدمات سے پوری طرح روشناس ہو سکے اور ادب وصحافت میں ان کے مرتبہ کو صحیح طور پر آنکا جا سکے۔

✿✿✿

ریاض قدوائی
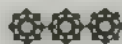
جی ڈی چندن کی یادیں اور باتیں

جی ڈی چندن کون ہیں؟ اگر کوئی یہ سوال کرے تو غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

مطلب یہ ہے کہ غالب کے بارے میں یا ہم خود اپنے بارے میں کیا کیا بتائیں اور کیا چھوڑیں۔ میں یہاں جی ڈی چندن کو غالبؔ کے برابر نہیں قرار دے رہا ہوں لیکن ان کے بارے میں بھی کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ جس میں انتخاب اور فیصلہ مشکل ہے۔ اگر کوئی ان کی زندگی، شخصیت اور کام، اس کام سے حاصل ہونے والے نتائج کو بیان کرنے بیٹھے تو باخبر اہل مطالعہ کے لئے یہ ایک مشکل کام ہے۔ اردو صحافت یا اخبار نویسی کی ابتدا یعنی ایک لحاظ سے مغل حکمرانی کے دور سے لے کر اس کی تاریخ، اس کے ادوار و مدارج، اس کے علاقوں وغیرہ کی تحقیق میں چندن صاحب کے عطیہ کی بابت یہاں بہت روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں پہلے ہی حیران ہوں کہ اتنے کثیر حقائق کے انبار لگانا ان کے لئے عملاً کس طرح ممکن ہوا جن کو محض دیکھنا ہی ہمارے لئے آسان نہیں ہے۔ بہر حال ان سطروں میں زیادہ تر توجہ ان کی شخصیت انداز و اطوار اور ان کے ساتھ ہونے والے اپنے روابط پر مرکوز کی جائے گی اور بحیثیت ایک ادیب فنون لطیفہ میں ان کے رول کا جائزہ لیا جائے گا۔

جی ڈی چندن یا گوربچن داس چندن جن کی تحریریں زیادہ تر گوربچن چندن کے نام سے منظر عام پر آئیں اپنے ظاہری حلیے اور انداز گفتگو میں اپنے طوفانی کام اور طاقتور تحریروں کی ضد معلوم ہوتے تھے۔ بالکل دبلا پتلا چہرہ اور جسم، آواز دھیمی اور پتلی، الفاظ یا لہجہ میں وہ زور یا قوت نہیں جو ایک بڑے آدمی میں نظر آتی ہے یا اپنے آپ کو بڑا ظاہر کرنے والے میں۔ اپنی بات کو وزن دار بنانے کے فطری تقاضے غیر ارادی طور پر بھی اس قسم کا زور بیان یا بلند آہنگی پیدا کر دیتے ہیں۔

وہ جب کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے، چاہے وہ ذاتی گفتگو ہو یا صحافت وغیرہ پر تو بہت تفصیل سے اپنی بات کہتے تھے، پھر بھی ان کی باتیں سنتے رہنے کا دل چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ان کا دلنشیں اور دھیما لب ولہجہ تھا۔ حالانکہ وہ زبان و بیان کے ماہر نہیں تھے اور نہ انہوں نے کبھی اس قسم کا دعویٰ کرنے کا اشارہ بھی دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تبادلہ خیال میں اپنی تفصیل پسندی کے باوجود اپنے شریک گفتگو کی بھی پوری بات توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے۔ مجھے بارہا پتہ چلا یعنی جب انہوں نے میری کسی بات کا جواب دیا، کہ جو کچھ اس وقت میں کہہ رہا تھا وہ اس پر ہمہ تن گوش تھے یہ ایسے لوگوں میں کم دیکھا جاتا ہے جو غور وفکر کرتے ہوں اور گفتگو کے بھی شائق ہوں۔

چندن صاحب کی ایک اور صفت یہ تھی کہ وہ عموماً اپنے بارے میں، اپنی ذات خاص کے بارے میں بات نہیں کرتے تھے حالانکہ ہر ایک کی طرح وہ اپنے کام پر بہت نازاں معلوم ہوتے تھے مگر یہ محض بین السطور ہی ظاہر ہوتا تھا، اپنے کام پر ان کا یہ تفاخر جیسے ایک نشہ ہو جس میں وہ سرشار رہتے تھے۔ کوئی ذرا چھیڑے تو فوراً موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے تھے یعنی صحافت کے مراحل، مدارج اور اشکال وغیرہ، مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے اس کو ذاتی رخ دیا ہو اور تحقیق و جستجو میں اپنی محنت شاقہ کی روداد سنائی ہو۔ اسی طرح ان کی زندگی کے بارے میں بھی مجھے ان سے بہت کم معلوم ہوا، جو کچھ میرے علم آیا ہے وہ یا تو ان کی خودنوشت سے یا پھر ان کے فرزند انل لکھینا کی زبانی، ان کی ذاتی گفتگو میں تھوڑا بہت معلوم ہوا۔

اپنے بیوی بچوں سے وہ بے حد محبت کرتے تھے مگر ان کا تذکرہ بھی ان کی زبان سے بہت کم سنا، کبھی کبھار اہلیہ کے جوڑوں کے عارضے کا سرسری ذکر اور پھر دوسری بات۔ میں اس وقت گفتگو کرنے کا زیادہ عادی نہیں تھا اور ایسے موقعوں پر سوالات بھی نہیں کرتا تھا۔ ان کی مختصر آپ بیتی بیٹے انل لکھینا کی کامیابیوں اور ناموری پر اور اپنے داماد کی کاروباری ترقی وخوش حالی پر ان کے اطمینان ومسرت کی جھلک دکھاتی ہے۔

چندن صاحب نے اپنی زندگی کے 73 سال یا اس سے زیادہ عرصہ ادب لطیف میں، عملی صحافت میں اور صحافت کی تحقیق میں صرف کیا۔ گو کہ اس میں ان کی حکومت ہند کی ملازمت کے 32 سال شامل تھے لیکن چونکہ یہ اخباری نوعیت کا کام تھا علاوہ اس کے اخباروں سے ان کا گہرا رشتہ رہتا تھا لہٰذا پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) کے اردو افسر اطلاعات کی حیثیت سے ان کے فرائض اور صحافتی تحقیق وجستجو ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے تھے، دراصل ان کی صحافتی، ادبی زندگی اور کام کو

برسوں میں ٹھیک ٹھیک متعین کرنا مشکل ہے۔ تحریر کا شغل انہوں نے بچپن سے شروع کر دیا تھا جب وہ ساتویں درجے میں پڑھتے تھے۔ باقاعدہ انقلابی اخبار لکھ کر تقسیم کرنا کالج کے دور میں معمول بن گیا۔ ایک صاحب تحریر سے یہ سہو ہوگئی (نام بتانا ضروری نہیں) کہ وہ 1942 میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ لینے پر گرفتار ہوئے، وہ گرفتار اسی دوران ہوئے مگر باغیانہ تحریروں کی بنیاد پر۔ سبھاش چندبوس کے آزاد ہند ریڈیو سے خبریں لکھ کران کو تقسیم کرنے یعنی اشاعت اور ایسا مواد رکھنے کی بنا پر ان کی گرفتاری ہوئی جو ستیہ گرہ اور ایجی ٹیشن سے دس گنا سنگین جرم مانا جاتا تھا۔

دفعات بھی بغاوت (ریاست کے خلاف جنگ) کی عائد کی گئیں۔ بقول ان کے ''اس کے پیچھے میرا وہی جنون تحریر تھا'' یعنی قصبہ کے کچھ نوجوانوں کو ساتھ لے کر تحریک آزادی کو مضبوط کرنے کے پرچار کے پیچھے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو صرف بیس سال کی عمر میں انہوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک کے کئی بڑے رہنماؤں کی نسبت زیادہ بڑا خطرہ مول لیا تھا جس کا نتیجہ ان کی والدہ کے غش کھا کر گرنے اور چند ہفتوں بعد ان کے انتقال کی شکل میں ظاہر ہوا حالانکہ چندن صاحب بعد میں اپنے وقت کے معروف وکیل کی کوششوں سے ضمانت پر رہا ہو گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب چندن صاحب کے والدین ان کو آئی سی ایس کا امتحان دلانے کی تیاریوں کا ارادہ رکھتے تھے۔ بہر حال جیل سے رہائی اور بی اے مکمل کرنے کے بعد انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور علم صحافت میں ڈپلوما بھی کیا اور بیک وقت انگریزی اور اردو اخباروں میں مصروف کار ہوئے۔ انہوں نے اپنی صحافت کی ابتدا ہی میں مشہور ومعروف انگریزی اخبار ''سول اینڈ ملٹری گزیٹ'' میں اور ہفت روزہ ساگر میں بالترتیب سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، مضمون نگاری کے ساتھ افسانہ نگاری بھی رک رک کر جاری رہی، 1947 میں ہیجانی دور میں ان کی شادی ایک صاحب مرتبت الیکٹریکل انجینئر کی بیٹی پرکاش رانی صاحبہ سے ہوئی اور ایک فرزند (انل لکھینا) اور ایک بیٹی چندن صاحب نے اپنی یادگاریں چھوڑیں۔ چندن صاحب کی زندگی میں دہلی میں ان کی اہلیہ سے راقم الحروف کی کئی بار ملاقات ہوئی جن کی بزرگانہ مہربانی آج بھی یاد آتی ہے، ان کے شوہر کی آپ بیتی سے پتہ چلتا ہے کہ شادی سے پہلے والدین کے ذوق اور کافی وسائل نے ان کی اہلیہ کے اندر سیر وسیاحت کے خاصے شوق کو پروان چڑھایا تھا مگر تقسیم ہند سے پہلے کے ہنگاموں میں شادی کے بعد ایسا کچھ نہ ہوسکا، اس ماحول میں خود اپنا اخبار نکالنے کا

منصوبہ پہلے ہی دھرا رہ گیا تھا جس پر وہ خطیر رقم خرچ کر چکے تھے، اس خاندان کو لاہور چھوڑ کر بالآخر دہلی آنا پڑا اپنی قابلیت کی وجہ سے (مقابلہ کے امتحان میں اول آنے پر) جلد ہی انہیں حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات میں ملازمت مل گئی۔ چندن صاحب اپنی زندگی اور سرگرمیوں کی جو روداد چھوڑ گئے ہیں اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ یہ موقع انہیں اس لئے ملا کہ اردو شعبہ کے بہت سے لوگ (مسلمان) ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اس طرح اردو اور جی ڈی چندن ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئے۔ چنانچہ آج بھی ان کا پختہ نقش باقی ہے۔1948 سے 1980 تک اس 32 سالہ خدمت کے دوران اردو اخبارات و جرائد سے اور خود اس زبان سے ایک نیا مخلصانہ رشتہ قائم ہوا (حالانکہ اسکول اور کالج کی عمر میں بھی اردو زبان و دب سے ان کے خصوصی لگاؤ کو سراہا گیا تھا اور اس سلسلہ میں چندن صاحب نے بی اے کے استاد مولانا تاجور کی عملی ستائش کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جنہوں نے ان کے دو نمبر بلاوجہ کاٹ لئے تھے یعنی 4 فیصد کیونکہ بقول استاد سو فیصد نمبر دوسروں کے حلق سے نہ اترتے۔

پی آئی بی میں چندن صاحب سے میرا رابطہ 1970 کی دہائی کے اوائل میں انفارمیشن آفیسر یعنی سربراہ شعبہ اردو کی حیثیت سے ہوا جب میں روزنامہ پرتاپ کا سب ایڈیٹر تھا (جو کہ اس زمانہ میں پورے شمالی ہندوستان اور خطہ گاؤ کا سب سے بڑا اردو اخبار تھا) لکھنو سے آ کر میں دلی میں ابھی گھر بار کے تقاضوں یا فرائض سے نا آشنا تھا ہفتے میں ایک دو بار چندن صاحب سے ضرور ملاقات کے لئے جانا ہوتا اور میں نے اسی وقت دیکھ لیا کہ ان کو اردو صحافت اور اردو اخبارات و جرائد کے بارے میں گفتگو کرنا بہت پسند تھا۔ اس سلسلے میں اخبارات کے ایڈیٹروں اور دیگر صحافیوں کا بھی ذکر آجاتا جو ہمیشہ ہی واجبی ستائش پیرائے میں ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی کسی صحافی یا خود اپنے محکمے والوں کی برائی کرتے یا مذاق اڑاتے نہیں سنا۔

پورے ملک کے اردو اخبار و رسائل ان کے پاس آتے تھے اس دفتر عظیم کو وہ خود صفحہ بہ صفحہ دیکھتے تھے، یہ نہیں کہ سرسری نظر ڈالی اور دوسرا اٹھالیا، یا کلیتًا اپنے عملے پر چھوڑ دیا۔ اردو اخبارات سے دلی تعلق خاطر اور دلچسپی ان کو اخبارات صرف واجبی سرکاری نظر سے نہیں دیکھنے دیتی تھی بلکہ ان کی نظر صحافت کے مختلف پہلوؤں، معیاروں اور ابعاد کی متلاشی رہتی تھی۔ سرکاری افسر اخبار کے محض سیاسی رویہ اور اداراتی رخ کو یا اپنے Reproductions (یعنی راست پی آئی بی مواد کی

ان اخباروں میں اشاعت) دیکھتا ہے یا پھر اپنے ماتحتوں سے ایسا کرنے کو کہتا ہے مگر جی ڈی چندن افسر کے علاوہ محقق اور مبصر بھی بن جاتے تھے، وہ تحریروں کے متن ومواد سے آگے اسلوب نگارش اور اخبار کے تکنیکی یا جمالیاتی پہلو اور دوسری چیزوں پر بھی رائے رکھتے تھے، ایڈیٹروں کو اس رائے سے آگاہ کرتے تھے جوان سے ذاتی رابطہ رکھتے تھے اور ان کے گرویدہ رہتے تھے، وہ ان ایڈیٹروں کو کارآمد مشورے دینا ضروری سمجھتے تھے جو کہ اپنے فرائض منصبی سے متجاوز تھے، ان کی آراء کا نچوڑ یہ تھا کہ وہ اردو اخبار میں انگریزی اخبار جیسی پیشہ وریت دیکھنا چاہتے تھے، یہ ایڈیٹر اپنے دور کے نامور صحافی یا عالم بھی ہوتے تھے۔ چندن صاحب ان سے اردو صحافت کے نقطہ آغاز سے لے کر اس کے ماضی وحال پر معلومات کا تبادلہ کرتے تھے یعنی ان لوگوں سے استفدہ بھی کرتے تھے، اس طرح یہ دلچسپی رفتہ رفتہ اردو صحافت کی تاریخ کی تحقیق اور اس کے حال کے تجزیہ میں بدل گئی کئی کتابیں اور کتابچے، رپورٹیں وغیرہ وجود میں آئیں جو آپ کے سامنے ہیں۔ سن رسیدہ صحافی رحمت اللہ فاروقی نے ایک بار ذاتی گفتگو میں اس شخصیت کا ذکر آنے پر یاد کیا کہ ہر سال رجسٹرار اخبارات ہند (آراین آئی) کی رپورٹ کا چندن صاحب جس طرح تجزیہ کرتے تھے اور خصوصاً اردو اخبارات وجرائد کا جائزہ لیتے تھے ویسی چیز ان کے بعد نہیں دیکھی گئی، ان کا یہ سالانہ تجزیہ یوں تو آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر ہوتا تھا تاہم یہ عموماً سبھی اخبارات اور ٹیلی ویژن کی بھی زینت بنتا تھا۔

گوربچن داس چندن کی پیدائش لاہور کے مضافات میں باغبان پورہ میں 8 اکتوبر 1922 کو ایک دولت مند تاجر خاندان میں ہوئی تھی، پیدائش کی چھٹی کی مذہبی رسوم میں ان کا نام لکھت رام قرار پایا تھا جو بقول خود زندگی بھر لکھتے رہنے کی علامت تھا، جلد ہی یہ تبدیل ہو کر گوربچن داس ہو گیا۔ (چندن صاحب بتاتے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی میاں افتخار الدین کے خاصے قریبی دوست اور تجارتی مشیر تھے جو کہ آگے چل کر پاکستان کے سرکردہ سرمایہ دار اور سیاستداں اور امروز پاکستان ٹائمز جیسے اخباروں کے بانی ہوئے۔ چندن صاحب کی کمسنی میں وہ کانگریسی لیڈر تھے)۔ اس پیدائشی دانشور کے "جنون تحریر" کا (یہ ان کے اپنے الفاظ ہیں) یہ حال تھا کہ اسکول کے کسی حریف سے جب جھگڑا ہوتا تو اس سے زبانی یا ہاتھوں کی لڑائی کے بجائے اس کی نثری ہجو لکھ کر نقلیں تقسیم کرتے تھے۔

1971 میں پی آئی بی میں چندن صاحب سے ملاقات کے بعد شائد ایک ہی سال کے اندر ہماری قریبی دوستی ہوگئی جب انہوں نے مجھ کو گھر لے چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے وہ دن اس

طرح یاد ہے جیسے ابھی پچھلے دن کی بات ہے۔ ہم جا کر سرکاری بس کی لائن میں کھڑے ہو گئے میری نوجوانی میں یہ معمولی بات تھی مگر وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے پھر بھی اول درجے کے افسر ہونے کے باوجود جب بیٹے بیٹی کی ذمہ داری بھی نہیں رہی تھی، روزانہ بس میں سفر کرتے تھے، آٹھ سال بعد ان کو ریٹائر ہونا تھا وہ کنجوس نہیں تھے، مجھ جیسے عام لوگوں کی بھی خاطر مدارات بخوبی کرتے تھے لیکن سادہ مزاج تھے۔

اپنے کمرے سے نکلنے سے لے کر قطار میں کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرنے اور اپنے گھر جنگ پورہ ایروز سینما پہونچنے تک وہ نئی دہلی (لوتین دہلی) جنگ پورہ بھوگل وغیرہ کی تاریخ بتاتے رہے، یہ کہ کس طرح ایک واقعہ کی بنا پر بھوگل جو پہلے بھوڈل گاؤں تھا لوتین دہلی سے الگ کر دیا گیا، برسوں بعد جب ان کی صحافتی تحقیقی سرگرمیوں کا پتہ چلا تو مجھے حیرانی ہوتی تھی کہ خالی وقت میں اور اپنے گھر پر ملاقاتوں میں وہ اپنی ان کاوشوں کا، اپنی مشقت اور اپنی ذات کا بکھان کیوں نہیں کرتے تھے جس میں بہت سے لوگوں کو تسکین ملتی ہے۔ ان ابتدائی برسوں میں یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ تنخواہ کے سوا ان کا شائد ہی کوئی ذریعہ آمدنی ہوتا ہو، اگر ہیرا پھیری، رشوت کمیشن نہ ہو تب بھی افسران ایک دوسرے کے نام سے کام کرتے اس کا بل بنواتے تھے۔ وزارت اطلاعات کے بارے میں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ یہ عام چیز رہی ہے مگر وہ اس نسبتاً حلال کمائی سے بھی گریز کرتے تھے۔

1987 میں کئی برسوں بعد ایک ادبی اجتماع میں میری اور چندن صاحب کی ملاقات ہوئی، ان کو معلوم تھا کہ میں سوویت دفتر (بارہ کھمبا روڈ) کو خیر باد کہہ کر صنعتی میدان میں سرگرم ہو گیا تھا۔ اس ملاقات میں جب میں نے ان کو بتایا کہ کارخانہ لگانے میں ناکام ہو کر میں دوبارہ صحافت میں واپس آ گیا ہوں، تو اظہار افسوس کرنے کے بجائے ان کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا اور فوراً سوئس برطانوی صحافی جیفرے کوس کے بارے میں بیان کرنے لگے جو فوج میں شامل ہو کر محاذ جنگ پر چلا گیا تھا، اور جنگ ختم ہونے پر دوبارہ صحافت میں آ گیا۔ شاید ان کے خیال میں میں بھی ایک قسم کی جدوجہد پر گیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میری ناکامی پر تأسف کے بجائے صحافت میں واپسی پر مسرت ظاہر کرنا۔ یہ مختصراً اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ اندازہ ہو سکے کہ صحافت کے پیشے سے ان کا کتنا گہرا لگاؤ اور دلی وابستگی تھی۔

سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو کر وہ جی جان سے تحقیق وجستجو میں لگ گئے۔ اس کے ساتھ حیدرآباد کے اخبار منصف کے نمائندے کی حیثیت سے ایکریڈیشن لے لیا اور اس میں لکھنا شروع

کردیا۔ افسانہ نگاری پس پشت چلی گئی۔

چندن صاحب کے قلمی کارنامے گنانا اور ان کی تشریح و توضیح اس تحریر کی بساط سے باہر ہے۔ ان کی دو کتابیں ''اردو صحافت کا سفر'' (جو 1857 کی جنگ آزادی کی ڈیڑھ صدی اور آزادیٔ ہند کی 60ویں سالگرہ پر 2007 میں شائع ہوئی) اور ''جام جہاں نما، اردو صحافت کی ابتدا'' (مطبوعہ 1991) ان کی درجنوں صحافتی تحقیقی کاوشوں میں شامل ہیں۔ ان کی تحقیق سے اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ مسٹر کے آر نارائنن نے استفادہ کر کے اردو ایڈیٹروں کے اجتماع میں اپنی تقریر شامل کیا۔ ان انکشافات پر تمام ایڈیٹر اور دیگر صحافتی دنگ رہ گئے اور اس وقت سے اردو صحافت کی تحقیق کے میدان میں چندن صاحب کے نام کا اور زیادہ ڈنکا بجنے لگا۔ پاکستان کے مشہور محقق اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے سربراہ جناب طاہر مسعود نے اس آخر الذکر کتاب کے جا بجا حوالے دیئے اور لکھا کہ ''میں جناب گوربچن چندن صاحب کا مشکور و ممنون ہوں جن کی اس موضوع پر محققانہ کتاب سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔''

ان کے افسانوں پر لکھنے کی میری خواہش تھی لیکن ابھی تک وہ دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کا وہ افسانہ مجھے بخوبی یاد ہے جس کا عنوان غالباً ''مجرم'' یا ''سوٹ کیس'' تھا۔ اس میں ایک پریشان حال شخص کسی کا سوٹ کیس چرا لیتا ہے مگر اناڑی مجرم ہے اور پولیس کے تعاقب سے فرار ہوتا ہوا ان ہی لوگوں کے گھر کے دروازے پر پہونچ جاتا ہے جن کا یہ سوٹ کیس تھا۔ وہاں کھویا ہوا مال واپس لانے والا شخص سمجھ کر خوشی سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اس میں نفسیات کی نکتہ دانی جا بجا ملتی ہے۔ چندن صاحب انسانی ذہن کے بے خطا عکاس اور یقیناً اس کو سمجھنے پر قادر نظر آتے ہیں۔

تقسیم ہند میں لاہور چھوڑنے یا آزادی کے بعد ان کی افسانہ نگاری ہی 1975 تک تقریباً واحد صنف تحریر تھی۔ مکمل سن بلوغ میں ان کا پہلا افسانہ ''بھیڑیے'' تھا جس میں اپنی گرفتاری سے متعلق واقعات اور کرداروں کا احاطہ کیا تھا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ان کے دوست رام پال نے اس کو ماہنامہ ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین کو دیا جنھوں نے فوری اشاعت کے بجائے اس کو آئندہ استعمال کے لئے رکھ لیا۔ ظاہر ہے یہ برطانوی دور حکومت تھا اور ممکن ہے یہ تحریر رسالہ بند

ہونے کا سبب بن جاتی۔ یوں بھی مصنف معتوب ہو چکا تھا۔

آگے چل کر ترک وطن کے واقعات کو افسانہ ''نئی صبح'' میں بیان کیا جو خاصی مدت کے بعد 1966 کے ہند۔ پاک معاہدہ تاشقند کے موقع پر شائع ہوا۔ 1965 میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی انجمن پین (Pen) نے ان کی افسانہ نگاری کو سراہا۔ ان کے دیگر افسانے بھروسہ، غم دل، پیاس نہیں بجھتی، انتقام، بگولے اور غنچے کی موت وغیرہ مختلف ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوئے۔ غالباً آخری افسانہ ''ایک اور سفر'' تھا جو سال خواتین پر لکھا گیا اور خواتین و جہیز سے متعلق تھا۔ یہ رسالہ آج کل کے علاوہ پبلیکیشنز ڈیویژن کے انتخاب میں بھی شامل ہوا۔ لاہور کے دور میں بھی ان کے متعدد افسانے شائع ہوئے۔

ان کے خیال میں تمام ادب وجدان سے پیدا ہوتا ہے جو بقول ان کے عرفان کے دائرے میں آتا ہے، افسانوں کے علاوہ انہوں نے ڈرامے اور دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی مثلاً طنز و مزاح۔ ''فلمی شاعروں کی کل ہند کانفرنس'' اور 1962 کی ہند چین جنگ کے بعد ''ہیون سانگ کا خط ماؤ زے تنگ کے نام''۔ ایسے مزاحیہ مضامین ہیں اپنی افسانہ نگاری کی بابت خود چندن صاحب کے کچھ خیالات جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

> ''میں افسانہ نگاری میں کسی گروہ کا حواری یا کسی نظریہ کا مبلغ نہیں ہوں بلکہ اپنے افسانوں کے ذریعہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں میرے افسانے نتیجہ نہیں بلکہ وسیلہ ہیں۔ ذہن کی ان گہرائیوں اور تنہائیوں سے واقفیت حاصل کرنے کا جو محسوس ہوتی ہیں لیکن گرفت میں نہیں آتیں۔ ہم کیا ہیں؟ ہمارا مشن کیا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے؟ بنی نوع انسان کے درمیان ہمارا رول کیا ہے؟ ایسے سوالوں کا جواب ہمیں آسانی سے نہیں ملتا۔ کم از کم روزمرہ کے معمولات میں تو ملنا دشوار ہے۔ خارجی واقعات بلاشبہ حقیقی اور ٹھوس ہیں لیکن باطنی شکووں اور سوالوں کو چپ نہیں کرا سکتے۔ چنانچہ ایک فنکار، ایک ادیب، ایک حساس شخص کی اظہار کی کاوش اور تمنا اکثر و بیشتر نا آسودہ اور بے چین رہتی ہے۔ وہ سر، تان، رنگ، شعر، افسانہ وغیرہ کے ذریعے سے اظہار کرتا رہتا ہے اور زندگی کے ابدی اور پر پیچ راستوں کے اسرار ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس کی قوت اظہار ہستی کی حقیقت کا ادراک کرنے کی ایک کاوش ہے۔''

صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے دل و دماغ کی بے کلی اور زندگی کے تجربات

سے پیدا ہونے والے محسوسات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے افسانہ کا وسیلہ اختیار کرتا رہا۔افسانہ میرے نزدیک زندگی کو جاننے کی ایک کاوش ہے۔گویا یہ ایک آئینۂ زندگی ہے جس میں ذہنی احساسات اور قلبی واردات کا عکس اترتا ہے۔میں اپنے ہر افسانہ میں کسی نہ کسی طرح سے شامل ہوتا ہوں۔بعض اوقات کردار میں، بعض اوقات اس کے پلاٹ کے واقعات میں، بعض اوقات اس کی تنقید حیات میں اور بعض اوقات اس کے نقطہ نظر میں۔اس میں کہیں نہ کہیں میرے احساس یا ادراک کی کوئی کڑی ضرور ہوتی ہے اور جب یہ کڑی قارئین کے دل میں بھی اتر جائے یا انہیں کسی طرح متاثر کرے تو اس سے زندگی کی ہمہ گیر اور صداقت اجاگر ہوتی ہے۔زندگی اپنی رنگارنگی کے فرق اور تضاد کے باوجود ایک سالم حقیقت ہے۔

بنیادی طور پر میرا اعتقاد یہ ہے کہ افسانے میں کوئی سماجی یا نفسیاتی بات ہونی چاہئے۔ یہ اس کے پلاٹ، سماں بندی، کردار نگاری، نفسیاتی تجزیہ اور اسلوب میں نظر آنی چاہئے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس میں وحدت تاثر ہونی چاہئے۔اس کے بغیر افسانہ افسانہ نہیں ہوسکتا ہے۔بظاہر شاید یہ محسوس ہو کہ یہ صرف اچھے مواد اور اچھے اسلوب ہی سے حاصل ہوسکتا ہے لیکن حقیقی کامیابی وجدان کی کیفیت پر منحصر ہے۔فن کا حسن ادیب کے اپنے ذہن ہی کا ایک جمالیاتی مشاہدہ ہے اور اس کا اظہار اس کی اپنی قدرت کا جوہر ہے۔

اپنی زندگی کے آخری برسوں میں چندن صاحب دہلی اور گڑگاؤں چھوڑ چکے تھے۔ ان کے فرزند انل لکھینا یقیناً والد کی تربیت اور تعلیم کی بدولت اور اپنی محنت و ذہانت سے پہلے آئی پی ایس میں کامیاب ہوئے پھر آئی اے ایس ہو گئے اور اس خدمت میں بھی انوکھی کارکردگی سے نام پیدا کر کے پدم شری ہوئے۔ وہ اور چندن صاحب گوڑگاؤں میں ساتھ رہے بعد میں ان کی بہن اپنے گھر میں اپنے والد کی خدمت کرتی رہیں اور اس طرح ان کی دعائیں حاصل کیں۔صحافت میں اس کو سنوارنے میں صحافتی تحقیق میں اور متعدد سربستہ حقائق کے انکشافات حوالے در حوالے کے ساتھ پیش کرنے میں اس باہمت شخصیت کی دین کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔"

❀❀❀
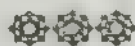
ندیم صدیقی

ممبئی میں اردو صحافت کا سفر اور صحافی

(ایک ناتمام تذکرہ)

چشم شعور ہی نہیں ہمارے بچپن کی آنکھیں بھی اس ممبئی کو دیکھ چکی ہیں کہ جس کے مضافاتی ریلوے (لوکل) اِسٹیشنوں کی تختیوں پر اردو میں بھی اس کا نام لکھا ہوتا تھا۔ روزنامہ اجمل، روزنامہ خلافت، روزنامہ ہلال، روزنامہ انقلاب، روزنامہ اردو ٹمئز، روزنامہ ہندوستان، روزنامہ آج، روزنامہ شام، روزنامہ قیادت اور روزنامہ اردو رپورٹر۔۔۔

سارے اخبارات اسی عروس البلاد ممبئی سے شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے ہم نے اکثر کو شعور کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی پڑھا ہے۔ ہمارے والد اور چچا کی اخبار بینی، عادت نہیں ایک ضرورت محسوس ہوتی تھی جو مجھے ورثے میں ملی اور پھر جالی محلے (ممبئی) میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا وہیں سامنے ایک اچھی خاصی کھتری لائبریری ہوا کرتی تھی، جس میں شہر کے اردو ہی نہیں دیگر زبانوں کے اخبارات و رسائل بھی باقاعدگی سے آتے تھے، میونسپل کارپوریشن کے زیرِ اہتمام چلنے والی اس لائبریری میں اردو زبان و ادب کی کتابیں بھی بڑی تعداد میں تھیں۔ یہ لائبریری صبح و شام کھلتی تھی اور بیک وقت 25۔ 30 آدمی اس میں بیٹھ کر اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کر سکتے تھے۔ ہمیں نہیں یاد آتا کہ ہم نے کبھی لائبریری کو پڑھنے والوں سے خالی پایا ہو۔ ہمارا ذوقِ مطالعہ اسی لائبریری میں پروان ہی نہیں چڑھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ذہن و قلب میں پڑھنے اور کچھ لکھنے کی بِنا بھی یہیں پڑی تھی۔

روزنامہ اجمل اور روزنامہ خلافت کی یادیں عمر کے ساٹھے پاٹھے نے نگل لی ہیں مگر ادھر ادھر سے ان اخبارات کے حوالے سے یادوں کی چند مچھلیاں حافظے میں اب بھی کہیں تیرتی ہوئی نظر آجاتی ہیں، اپنے چند بزرگوں کی روایتوں کے جھل مل کرتے دِیئے بھی یادوں کی چوکھٹ پر اس وقت رہنمائی کر رہے ہیں۔

مذکورہ لائبریری میں اس وقت ہماری دلچسپی کا مرکز وہ اخبارات ہوا کرتے تھے جن میں ہفتے

میں ایک بار بچوں کیلئے بھی کوئی صفحہ مختص ہوتا تھا۔ اجمل اور خلافت کے بارے میں تو یاد نہیں آتا مگر اِنقلاب اور اردو ٹائمز میں باقاعدگی سے بچوں کی دنیا اور پھلواری کے عنوان سے جو صفحات آتے تھے۔ وہ بلاناغہ ہم پڑھتے ہی نہیں تھے بلکہ بے چینی سے اس کے منتظر بھی رہتے تھے۔ انقلاب میں جہاں انور اشفاق اس صفحے کو مرتب کرتے تھے تو اردو ٹائمز میں ایم اے حجازی (مرحوم) کی نگرانی میں یہ صفحہ سجایا جاتا تھا۔

ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ان صفحات میں بچوں کی لکھی ہوئی چیزوں کو نمایاں مقام ملتا تھا ، یہی وہ صفحات تھے جن میں ہماری تحریریں چھپتی تھیں تو جس خوشی کا احساس اس وقت ہوتا تھا اس کو ضبطِ تحریر میں لانا آج ہمارے لئے مشکل ہے۔

انقلاب اور اردو ٹائمز میں خواتین کیلئے بھی صفحات شائع ہوتے تھے ، اسی طرح فلموں کا خصوصی صفحہ بھی ان کا حصہ ہوتا تھا ایک لفظ سلو لائیڈ جو آج ہمارے ہاں بھلا دِیا گیا ہے۔ اِنہی اخبارات میں سے کسی ایک کے فلمی صفحے کا نام سلولائیڈ کی دنیا تھا۔

ہم نے اِس مضمونچے کی ابتدا میں جن اخبارات کے نام گنوائے ہیں ان میں روزنامہ ہندوستان کے ساتھ جن اخبارات کا ذکر ہے، وہ تمام اخبارات دوپہر کے بعد شائع ہوتے تھے اس وقت کے لوگ ان اخبارات کو باقاعدگی سے پڑھتے تھے اگر کسی وجہ سے اخبار فروش نہیں آیا تو لوگ اپنی دکان یا گھر سے نکل کر دوسروں سے پوچھتے تھے کہ۔۔۔ کیا آج اخبار والا نہیں آیا۔؟

روزنامہ ہندوستان شروع ہی سے بڑے سائز میں نکلتا رہا ہے روزنامہ آج، قیادت اور شام یہ چھوٹے (ٹیبلائڈ) سائز میں چھپتے تھے جبکہ رپورٹر کا سائز اِن اخبارات سے بڑا ہوتا تھا۔

روزنامہ انقلاب کے بانی و مدیر عبدالحمید انصاری تو اردو ٹائمز کے موسس و مدیر محمد نذیر تھے۔ رامپور سے تعلق رکھنے والے غلام احمد خاں آرزو ہندوستان کے مدیر و مالک تھے اس زمانے کے اردو والوں میں عوام کی بھی اچھی خاصی تعداد اداریہ وغیرہ پڑھتی تھی۔ لہٰذا اِن تمام اخبارات میں اداریے پر بالخصوص توجہ دِی جاتی تھی۔

روزنامہ انقلاب میں خلش جعفری اور روزنامہ اردو ٹائمز میں شہریار عابدی کے اداریوں کی اس

زمانے میں دھوم تھی۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں آخر الذکر اداریہ نویس کی تحریریں تو نعرہ تکبیر کی سی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ حنیف اعجاز اور انجم رومانی بھی اردو ٹائمز میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔

روز نامہ ہندوستان کے حوالے سے ذہن کے ایک گوشے میں ایک نام روشن ہو رہا ہے، اس وقت دو ڈاکٹر ذاکر حسین مشہور تھے ایک ڈاکٹر ذاکر حسین) وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ صدرِ جمہوریہ ہند (اور دوسرے تھے ممبئی میں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کو ہم جانتے ہی روز نامہ ہندوستان کی وجہ سے تھے۔ یہ موصوف ہندوستان کے لیے اداریہ لکھتے تھے جو عوام میں خاصا مقبول بھی تھا۔ جبکہ ان کا اصل پیشہ تدریس تھا۔ ابتدا میں انہوں نے سیفی ہائی اسکول اور پھر ڈیوڈ سیسون ہائی اسکول (نزد بائیکلہ) میں پڑھایا بعد میں مہاراشٹرا کالج میں استاد مقرر ہوئے۔

روایت ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی گریجویٹ تھے۔ ان کے ساتھ ڈگری کا ایک دلچسپ معاملہ تھا کہ انہوں نے پی ایچ ڈی پہلے کی اور (سیاسیات میں) ایم اے بعد میں کیا۔ غالباً ان کی علمی استعداد کی بنا پر انھیں بی اے میں فرسٹ کلاس کے سبب پی ایچ ڈی کی اجازت مل گئی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کا وائیوا لینے کے لیے دہلی سے پروفیسر گوپی چند نارنگ آئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے زیر نگرانی میرزا دبیر پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ فاروقی کا علمی تفوق اپنے ہم عمروں ہی میں نہیں تھا بلکہ اپنے معاصر اہل علم کے حلقے میں بھی انھیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ جس کی دلیل میں صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ وہ روزنامہ ہندوستان جیسے ادارے سے وابستہ ضرور تھے مگر اخبار کے دفتر میں ان کی حاضری نہیں ہوتی تھی بلکہ ہوتا یہ تھا کہ ہندوستان کا ایک ملازم روزانہ وقتِ مقررہ پر فاروقی کے گھر سے اداریہ لے جاتا تھا۔ یہ اعزاز ہمارے دور میں کسی صحافی کو نصیب نہیں۔

سید محمد عباس سے روایت ہے کہ ڈاکٹر فاروقی نے کچھ مدت افریقہ میں بھی درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ بے پناہ ذہین، حاضر جوابی میں تو اپنے حلقے میں بے مثل تھے جتنے اچھے مقرر تھے تو اتنی ہی اچھی تصنیفی صلاحیت سے بھی قدرت نے انھیں مالا مال کر رکھا تھا۔ لکھنو سے وطنی

نسبت کا حامل شیعانِ ممبئی کا یہ طوطی سرطان جیسے مرض کا شکار ہوا اور آج عروس البلاد میں رحمت آباد کے شہر خموشاں کے اسرار کا حصہ بنا ہوا ہے۔

بزرگوں سے روایت ہے کہ کسی زمانے میں روزنامہ اقبال عروس البلاد ممبئی کا سب سے بڑا اخبار ہوا کرتا تھا، اس کا اپنا پریس بھی تھا۔ آج انقلاب اس شہر کا بڑا اخبار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا بھی اب اپنا پریس ہے جہاں دوسری زبانوں کے اخبارات بھی چھپ رہے ہیں۔ شاید کسی کو یقین نہ آئے کہ یہی انقلاب اپنے ابتدائی ایام میں اقبال کے پریس میں چھپتا تھا۔ راوی بتاتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ انقلاب کی کاپی پریس میں جلد آجاتی تھی تو اقبال کے مالک کبیر صاحب بلند آواز سے کہتے تھے کہ پہلے اقبال چھپے گا اور یہ سنتے ہی انقلاب کے مالک و مدیر، اقبال پریس کے اِحاطے میں کاغذ کے رِم بچھا کر سو جاتے تھے، اب نہ وہ کبیر صاحب ہیں اور نہ ہی ان کا اقبال اور نہ ان کے نام لیوا، البتہ عبد الحمید انصاری کا روزنامہ اپنی سترویں سالگرہ منا چکا ہے اور شہر کا ایک اہم چوراہا عبد الحمید انصاری سے موسوم ہے۔

انقلاب، ملک کی آزادی کے بعد اردو کا واحد اخبار ہے جس کے بطن سے انگریزی کا ایک روزنامہ مڈ۔ڈے (Mid-Day) جاری ہوا جو اپنے آپ میں ایک تاریخی واقعہ ہے اور اسی ادارے سے گجراتی کا بھی ایک روزنامہ (گجراتی مڈ۔ڈے) شائع ہو رہا ہے۔

اردو کے اس اخبار کی ترقی میں مرحوم عبد الحمید انصاری کی محنت ولگن اور مستقبل شناسی کو بڑا دخل ہے اسی کے ساتھ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ انصاری مرحوم کے فرزند خالد انصاری نے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر، وقت کے ساتھ چلنے کی کوشش کی اور ان کی یہی کوشش آج مڈ۔ ڈے کی شکل میں اس صحافتی ادارے کو ایک گھنے سایہ دار شجر کی صورت دے چکی ہے۔ (واضح رہے کہ خالد انصاری کو ان کے والد نے اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے امریکہ بھیجا تھا) جس میں آج بغیر تفریق مذہب وملت لوگ برِ سر روزگار ہیں۔ آج اس ادارے کو ملک کی ایک بڑی اشاعتی کمپنی نے خرید لیا ہے جس کے منصوبے کے تحت روزنامہ انقلاب ملک کے تمام ممتاز شہروں سے شائع ہو رہا ہے۔ اب تک کی اطلاع کے مطابق انقلاب شمالی ہند کے دس سے زائد شہروں

میں مشہور شاعر، براڈ کاسٹر اور ممتاز صحافی شکیل حسن شمسی کی اِدارت میں اپنی دھنک رنگی بکھیرنا شروع کر چکا ہے، لوگ اسے اردو کی ترقی سے بھی تعبیر کر رہے ہیں تعجب۔۔۔!

اسی طرح ممبئی کا دوسرا اخبار روزنامہ اردو ٹائمز بھی اپنے میدان میں پیچھے نہیں رہا۔ اس مراٹھی رِیاست میں اردو ٹائمز کے ادارے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے ایک ہندی روزنامہ جاری کیا۔ ہر چند کہ نا مساعد حالات کے سبب یہ دینک زیادہ مدت جاری نہ رہ سکا مگر اردو ٹائمز کے کارپردازوں کی جستجو اور نئی منزلوں کی طرف بڑھنے کی لگن ایک تاریخ ضرور بن گئی ہے اور عوام کے ایک خاصے طبقے میں اسی روزنامے کی طلب آج بھی اولیت کا درجہ رکھتی ہے جس نے چند برس قبل ہی شاندار پیمانے پر اپنی پچاسویں سال گرہ کا جشن منایا ہے۔

روزنامہ ہلال کے حافظ علی بہادر خاں شہر کے ایک ممتاز شخص تھے اور ان کا اخبار بھی اردو والوں کے ایک طبقے میں خاصا پسند کیا جاتا تھا، ان کے نام سے مدنپورے کے علاقے کی ایک سڑک منسوب ہے۔ یہ اخبار کب بند ہوا یہ تو نہیں یاد مگر ممبئی کے ڈونگری (علاقے) میں واقع ہلال پریس یوں یاد ہے کہ اس پریس میں راقم السطور نے کچھ چیزیں چھپوائی ہیں۔

روزنامہ اجمل تو گاندھی وادی حضرات کی یادگار تھا، جس کا پریس اور دفتر ممبئی کے مرکزی علاقے ڈاکٹر اقبال چوک (جے جے اسپتال سرکل) پر واقع تھا۔ اس پریس میں بھی کبھی کبھار پوسٹر اور ہینڈ بل ہم نے چھپوائے ہیں۔ آج وہ پریس تو نہیں رہا البتہ اس کا دفتر ممبئی کے مشہور صحافی خلیل زاہد کا آفس بنا ہوا ہے جہاں سے وہ چند برس قبل اخبار عالم (ویکلی) اور روزنامہ امروز شائع کرتے تھے۔

اسی شہر سے روزنامہ جمہوریت مولانا حامد الانصاری غازی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا حامد الانصاری غازی کو نہ صرف ہم نے دیکھا ہے بلکہ اِن بزرگوار کو اپنی شاعری واعری بھی سنانے کا شرف حاصل رہا ہے۔

روزنامہ شام، ادارہ انقلاب کا شامنامہ تھا، روزنامہ آج کے مدیر و مالک خلیل احمد خلیاش تھے جبکہ روزنامہ قیادت، ابراہیم فطرت کی اِدارت میں شائع ہوتا تھا۔ مگر اس شامنامے کی ادارت کی اصل باگ ڈور مصطفےٰ نثار عثمانی کے ہاتھوں میں تھی جن کا شعری ذوق بھی خوب تھا اور روزنامہ

اردو رپورٹران اخبارات کے مقابلے میں بہت جونیئر شامنامہ تھا مگر اپنے انداز اور صوری حسن کے سبب اسے جلد ہی عوام میں قبول مل گیا تھا لیکن افسوس یہ ہے کہ کم عمری ہی میں بند ہوگیا۔

اردو رپورٹر کے ایک مدیر عبد الرشید اس کی یاد دِلانے کیلئے ابھی کل تک بقیدِ حیات تھے اللہ بخشے یہ موصوف جولائی 2012 میں راہی عدم ہوئے۔

اسی طرح مشہور فلم رائٹر جاوید صدیقی (رامپوری) کا تذکرہ نہ کرنا خلافِ انصاف ہوگا کہ یہ موصوف بھی روزنامہ اردو رپورٹر کے موسس اور ادارتی سربراہوں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے ممبئی کے ایک قدیم روزنامے، خلافت سے اپنا صحافتی سفر شروع کیا تھا۔ موصوف ایک اعلی درجے کے ادیب بھی ہیں ان کے لکھے ہوئے خاکوں پر مشتمل ایک کتاب روشندان شائع ہوکر خواص وعوام میں مقبول ہوئی۔ زبان و بیان اور تاثیر و تاثر سے بھری پری یہ کتاب دورِ گزشتہ کے تاریخی کردار بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ہندوستانی فلموں میں جاوید صدیقی کی فتوحات کون نہیں جانتا۔۔۔!!

ہمارے ایک بزرگ دوست عثمان غنی روزنامہ آج پھر ہندوستان سے وابستہ رہے۔ وہ ممبئی میں کرائم رپورٹر کے طور پر نیک نام تھے۔ جب بھی ہم انھیں دیکھتے تو حضرتِ بلال حبشی یاد آجاتے تھے۔ مگر ان کے شیشہ قلب پر کسی بھی طرح کے داغ دھبے تو کجا ایک سیاہ چھینٹا بھی نہیں تھا۔ برسوں قبل مرحوم عثمان غنی کی ایک کتاب چہرے شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے شہر کے سفید پوشوں کی نقاب کشائی کی تھی یا پردہ پوشی؟۔۔۔ہم کیوں بتائیں، چہرے آپ خود پڑھیں۔

ممبئی کے قدیم صحافیوں میں جنہیں نئی نسل نہیں جانتی ان میں مولانا فجندی (اجمل) علامہ بدر جلالی (خلافت) معین الدین حارث (اجمل) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ ممبئی کی اردو صحافت کے ستون تھے اسے ہمارا غلو، نہ سمجھا جائے تو عرض ہے کہ آج (کم از کم ممبئی جیسے شہر) کی اردو صحافت میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اپنی علمی وفنی استطاعت کے سبب اِن بزرگوں کی صف میں شامل کیا جاسکے اور موجودہ صحافیوں کے ظاہری ٹھاٹ باٹ، شہرت اور مالی منفعت کے سامنے مذکورہ بزرگ کہیں پیچھے تھے۔ ہم یہاں صرف معین الدین حارث کا ذکر کرینگے۔ مرحوم کھدر کی شیروانی اور پیروں میں کولہاپوری چپل پہنے دفتر اجمل (جے جے ہسپتال کے چوراہے جو آج ڈاکٹر

اقبال چوک سے معروف ہے) سے انجمن اِسلام (وی ٹی ریلوے اسٹیشن) پیدل جاتے تھے، جس زمانے میں ہم نے انھیں دیکھا وہ (ممبئی کے سب سے بڑے مسلم تعلیمی ادارے) انجمن اسلام کے صدر تھے مگر ان کی سادگی اور بے لوثی کا سایہ بھی آج کے صدورِ انجمن اسلام کو چھو کر نہیں گزرا۔ وہ اعلی درجے کی سیاسی بصیرت کے حامل تھے، ٹائمز آف انڈیا کے مشہور شامنامے ایوننگ نیوز میں باقاعدہ M.Haris کے نام سے وہ ایک کالم لکھتے تھے انگریزی کے قارئین اسے کسی انگریز M.Haris کا مضمون سمجھ کر بصد شوق پڑھتے تھے۔ اسی طرح ان کا ایک کالم مراٹھی کے روزنامے میں بھی مقبول تھا۔ مراٹھی یقیناً ان کے گھر کی بولی تھی مگر جب لکھنو، دہلی اور الہ آباد کا کوئی اردو والا انھیں اردو میں تقریر کرتے سنتا اور جب اسے یہ بتایا جاتا کہ یہ حضرت نہ دہلی کے ہیں اور نہ لکھنو کے بلکہ یہ تو سپوتِ کوکن ہیں تو وہ حیرت سے منہ تکتا رہ جاتا تھا۔ ان کے اخلاص اور بے لوثی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مرارجی دیسائی نے اپنی وزارتِ عظمی کے زمانے میں انھیں جنتا پارٹی کی قومی صدارت کی پیشکش کی مگر انہوں نے اپنے شہر ممبئی سے دہلی جانا پسند نہیں کیا۔ معین الدین حارث کے بیلوث کردار اور ان کے تبحر علمی کا ایک زمانہ معترف ہی نہیں بلکہ ان کی عزت واحترام میں سر جھکا دیتا تھا۔

اس وقت اپنے ایک عزیزِ شاہد ومشہود اور دیرینہ رفیقِ کار کا یہ جملہ لطیف ذہن میں گونج رہا ہے: ندیم صاحب !اب اخبار علم وِلم سے نہیں نکلتا۔ جسے سن کر ہم اس وقت بھی ہنس پڑے تھے اور آج بھی جب یہ جملہ یاد آتا ہے تو اسی ہنسی کے ساتھ۔

اردو کے مشہور ادیب و ناقد ڈاکٹر ظ انصاری کا نام بھی ممبئی کے صحافیوں میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ جنہیں ہم نے دیکھا ہی نہیں ان کے ساتھ کام کر کے آج اخبارچی کہے جاتے ہیں ۔ حقیقت تو یہ بھی ہے کہ ظ انصاری نے اپنے عہد میں اردو صحافت کو جس مقام پر پہنچا دیا تھا وہ خود اپنے آپ میں ایک تاریخی واقعہ ہے ۔ جس کا ثبوت ان کے مجلّے آئینہ کے صفحات ہیں ۔ آزاد ہندوستان میں یہ ہفت وار ممبئی سے (چھٹی دہائی میں) فوٹو آفسیٹ کی تکنیک سے شائع ہونے والا اپنے دور کا ممتاز ترین ہی نہیں ایک مثالی مجلّہ بن گیا تھا۔

ممبئی کی صحافتی تاریخ میں یہ اعزاز بھی ڈاکٹر ظ انصاری ہی کو حاصل رہا کہ وہ روزنامہ انقلاب

کے دو بار مدیر بنے ۔ ہر چند کہ دونوں بار اپنے مخصوص مزاج کے سبب انھیں اس ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔

انقلاب میں جب وہ دوسری بار 1986 میں مدیر بنائے گئے ۔تو انہوں نے اِس اخبار میں جز وقتی ادارتی کام کرنے والوں کو دفتر باہر کیا اور وہ لوگ جو باصلاحیت تھے ان کے لئے کل وقتی ملازمت کے بند دروازے کھولے۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اخبار کی ملازمت سے معاشرے میں ایک نمایاں تشخص حاصل ہو جاتا ہے جس کے سبب اس دور کے بہت سے ٹیچر اور دیگر حضرات (دِن کے اوقات میں) کہیں اور کل وقتی ملازمت کر رہے تھے اور شام کے اوقات میں انقلاب کی جز وقتی ملازمت کی کرسی پر بھی براجمان ہوتے تھے۔ڈاکٹر ظ انصاری نے انھیں پیش کش کی:

آپ یا تو انقلاب کی کل وقتی ملازمت سے رِشتہ رکھیں یا اپنے اسکول سے۔۔۔

بصورتِ دیگر قوم کے دوسرے بے روزگاروں کیلئے انقلاب کا راستہ صاف کردیں۔

روز نامہ انقلاب میں ہماری ملازمت کو استحکام بھی ظ مرحوم ہی کی وجہ سے ملا تھا۔جس کا دورانیہ 22 سال پر محیط ہے۔واضح رہے کہ راقم السطور 2009 میں انقلاب (ممبئی) کی ملازمت سے ریٹائر ہوا ہے۔

کسی بھی اخبار میں مدیر کے ساتھ اس کا عملہ بھی ماہرانہ صلاحیت کا حامل نہ ہو تو وہ اخبار کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہاں ہمیں اپنے وہ تمام ساتھی یاد آتے ہیں جن کی معیت میں ہم نے انقلاب میں کام کیا۔محمد سعید انصاری کسی کالج یا کسی یونیورسٹی کے فارغ نہیں تھے مگر اپنی محنت سے اتنی علمی استطاعت پیدا کر لی تھی کہ وہ کتابت ، کاپی پیسٹنگ کے ساتھ ترجمہ بھی اعلی درجے کا کرتے تھے اپنی صلاحیت اور محنت نیز اِخلاق کے سبب وہ انقلاب کے نیوز ایڈیٹر کے منصب پر فائز تھے اور اسی ملازمت کے دور میں وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ نیاز اعظمی کلکتہ یونیورسٹی کے ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انقلاب میں دو ایم اے ہیں ایک (ایڈیٹر اِن چیف) خالد انصاری دوسرے نیاز اعظمی۔

عبدالحمید انصاری کے زمانے کے، اور دفتر میں سب سے سینئر تر تھے کامریڈ محمود رہاہی جو اردو کے

مشہور شاعر محوی صدیقی لکھنوی کے فرزند تھے۔ انہوں نے پوری عمر انقلاب میں گزاری عموماً وہ بڑی خبر ہی بناتے تھے۔ ان کی ہینڈ رائٹنگ ہمیں آج بھی یاد آتی ہے نہایت صاف اور چھوٹے چھوٹے لفظ لکھتے تھے۔ مالکان اِس درجہ ان کا احترام کرتے تھے کہ آخری دِنوں میں وہ دفتر تو آتے تھے مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا اور تنخواہ پورم پور دِی جاتی تھی۔ موصوف اپنی کرسی ٹیبل پر کاغذ قلم لئے ایک اہتمام کے ساتھ ایسے بیٹھے رہتے تھے کہ جیسے تھوڑی دیر میں وہ بڑی خبر بنا کر دینے ہی والے ہیں۔

ایک واقعہ یہاں یاد آتا ہے۔ دفتر میں کچھ ساتھیوں کی کام چوری کے سبب انتظامیہ کی طرف سے ہر شخص کو روزانہ اپنی کارگزاری ایک کاغذ پر لکھنے کا حکم ہوا وہ کاغذ، یک ورقی فارم کی شکل میں دفتر کی طرف سے سب کو دِیا گیا۔ محمود راہی یک ورقی فارم اپنے ٹیبل پر رکھ کر کسی حاجت کے سبب کہیں چلے گئے جب لوٹے تو وہ فارم اڑ کر ان کی کرسی کے نیچے ردی میں جا پڑا۔ ہماری نظر پڑی تو ہم نے اسے اٹھا کر انھیں دیا کہ راہی صاحب یہ آپ کا فارم اڑا اڑا پھر رہا ہے۔ کیا اسے پر نہیں کریں گے۔؟

محوی صدیقی کے فرزندِ ارجمند، نہ جانے اس وقت کہاں محو تھے کہ ہماری بات کو انہوں نے طنز سمجھ لیا اور نیوز ایڈیٹر سعید انصاری سے شکایت کی کہ کل پرسوں کے آئے ہوئے لونڈے ہم سے کہہ رہے ہیں کہ کارگزاری درج نہیں کروگے۔۔۔؟

بھائی سعید انصاری اور ہم رات، ایک ساتھ گھر لوٹتے تھے انہوں نے راستے میں ہمیں یہ بات بتائی اور سخت سست کہا کہ میاں راہی صاحب تم سے بہت سینئر ہیں تم کو ان کا لحاظ رکھنا چاہئے تھا۔

ہم نے اپنی صفائی میں سارا واقعہ کہہ سنایا مگر۔۔۔!

سوئے اتفاق دوسرے دِن (21 اپریل 1986) مشہور ترقی پسند ناقد و ادیب سبطِ حسن جو پاکستان سے کسی سیمینار میں شرکت کیلئے دہلی آئے ہوئے تھے، دورہ قلب کے سبب جاں بحق ہوئے تو ان کی خبر محمود راہی ہی نے بنائی جس کی سرخی اور متن میں سبط کو وہ س کے بجائے ص سے (صبط حسن) لکھ گئے۔ ہم ان دِنوں تصحیح نگاری پر مامور تھے۔ کاتب نے بھی مکھی پر مکھی ماری۔ ہمیں گزشتہ رات کی سرزنش نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا سو ہم نے صبط حسن کا مسودہ اپنی جیب میں رکھا اور جیسا اِملا لکھا گیا تھا، اسے ویسا ہی جانے دِیا۔

دوسرے دن کے انقلاب میں صفحہ اول پر ص سے سبطِ حسن کی خبر چھپی تو قارئین کے کئی فون آئے۔ مدیرِ محترم ظ انصاری نے محمود راہی سے سوال کیا تو انہوں نے جواب دِیا۔ بیشک میں اِملے میں غلطی کر گیا اور اس کا احساس گھر جانے کے بعد ہوا۔

ظ صاحب نے ہم سے کہا: میاں ندیم ! آپ تو سبطِ حسن کو جانتے بھی ہیں، یاد آتا ہے کہ آپ مجھ سے ان کی کتاب سخن در سخن پڑھنے کیلئے لے گئے تھے پھر بھی ان کے نام کا اِملہ ص سے جانے دِیا۔!

ہم نے ایک چپ ہزار بلا ٹالنے والے فارمولے پر عمل کیا۔ مگر آج جب سوچتے ہیں تو اپنی اس حماقت پر شرمندگی ہوتی ہے۔

مشہور ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر نقطوں سے عاری ہوتی تھی، کاتب اپنی صوابدید سے نقطے لگاتا جاتا تھا۔ قدما کا خط جن لوگوں نے پڑھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ خوشخط سے خوش خط اہلِ قلم بھی نقطوں کے معاملے میں دامنِ احتیاط چھوڑ رکھتا تھا۔ ممبئی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس تھا اس موقع پر انقلاب میں ڈاکٹر ظ انصاری نے اداریے میں کہیں علمائے فحول لکھا، حضرتِ کاتب نے اسے علمائے مخول پڑھا ہی نہیں، لکھا بھی، ظاہر ہے دوسرے دِن یہی علمائے مخول اخبار کے اداریے میں چھپا بھی، اجلاسِ مذکور میں اس اداریے پر ہنگامہ ہوا کہ انقلاب کے اداریہ نگار نے علما کی توہین کی ہے۔ نتیجے میں مولانا ضیا الدین بخاری نے انقلاب کے خلاف نعرے لگوانے کا اعلان کیا کہ حاضرین جب میں کہوں۔۔۔ انقلاب ۔۔۔ تو آپ لوگ مردہ باد مردہ باد کہیے۔ ہوا اِس کے برعکس جب مولانا ضیا الدین بخاری نے زوردار آواز میں کہا:

۔۔۔ انقلاب۔۔۔ تو عوام کی آواز گونجی۔۔۔ زندہ باد۔۔۔ زندہ باد۔۔۔ مولانا موصوف نے لوگوں سے پھر کہا کہ۔۔۔ زندہ باد نہیں۔۔۔ مردہ باد کہیے۔۔۔ مردہ باد۔۔۔!

مختصر یہ کہ مولانا کی بار بار کی تاکید کے بعد لوگوں نے مردہ باد کا نعرہ لگایا۔ یہ واقعہ ہمیں انقلاب کے سب ایڈیٹر تشنہ صاحب کی حرارتِ عزیزی نے یاد دِلایا۔ پہلے تشنہ مرحوم کا مختصر تعارف ہو جائے۔

ہمارے بزرگ دوست (ممتاز فکشن نگار اور شاعر) ایم اے تشنہ نہایت محنتی اور صِرف کام کرنے والے سینئر ترجمہ نگار تھے لوگ باگ ایم اے اپنے نام کے ساتھ اخیر میں لکھتے ہیں مگر

شمس آباد(ضلع فرخ آباد) کے تشنہ صاحب مجسم ایم اے ہوتے ہوئے بھی ایم اے نہیں لکھتے تھے، ان کے نام کے شروع میں جو ایم اے تھا وہ ان کے خاندانی نام یعنی مقبول احمد کا مخفف تھا۔تشنہ مرحوم نے اپنی عمر کے آخری دِنوں تک انقلاب میں معمہ سازی کی۔ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ رِیاضی میں کمال کا ذہن رکھتے تھے لاکھوں کے اعداد کی۔۔۔نفی، جمع،ضرب کے حاصل کوایک ہی سانس میں بتا دیتے تھے۔ یہ سنی سنائی نہیں آزمائی ہوئی بات ہے۔ یہ وصفِ ریاضی انھیں فطری طور پر ودیعت ہوا تھا جب وہ طالب علم تھے تو ان کے استاد کلاس میں چیلنج کرتے تھے کہ ہے کوئی ریاضی میں، میرے شاگردِ مقبول کو پچھاڑنے والا؟

کسی زمانے میں ان کی افسانہ نگاری کے چرچے ماہنامہ بیسویں صدی (دہلی) میں ہوتے تھے۔مگر ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ علم وادب کی کوئی بات جوان کے ذہن میں جگہ بنا لے اور وہ غلط ثابت کر دِی جائے، تب بھی اس کی تصحیح کیلئے وہ راضی نہیں ہوتے تھے، بظاہر بحث نہیں کرتے تھے مگر مانتے بھی نہیں تھے۔مثلا طب کی ایک اصطلاح ہے حرارتِ غریزی (یعنی طبعی حرارت) وہ مگر عمر اسی پر اصرار کرتے رہے کہ یہ حرارتِ عزیزی ہے، تشنہ مرحوم ہمیں بہت عزیز تھے سو ہم نے تما ما حرارتِ عزیزی کو کبھی سرد نہ ہونے دِیا۔ اللہ ان کی مغفرت ہی نہیں ان کے درجات بھی بلند کرے۔ان کے بارے میں بہت سوچنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ پٹھانوں کی بستی قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کے خاں صاحبوں کی رعیت، انصاری برادری کے مقبول احمد، پٹھانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بس۔۔۔!

غربت وخوف مل کر انسان کی نفسیات کو عجب بنا دیتا ہے۔تشنہ صاحب اسی نفسیات کی ایک چلتی پھرتی تصویر بن گئے تھے یعنی افلاس نے ان کی نفسیات کو مجروح کر دیا تھا۔ اللہ اِس افلاس سے کسی بھی حساس قلم کار کو دور رکھے۔ان کے بعض افسانے حقیر نے پڑھے ہیں انہی کے نتیجے میں یہ بات لکھ گیا۔ یہ حرارتِ عزیزی بھی علمائے مخول جیسی ہی غلطی رہی ہوگی کہ کسی کاتب نے حرارتِ غریزی کو حرارتِ عزیزی لکھ مارا جس پر ہمارے تشنہ صاحب ایسے ایمان لائے کہ مرتے مر گئے مگر حرارتِ عزیزی کو دِل ودماغ سے کم نہیں ہونے دِیا۔

ایک واقعہ تشنہ مرحوم کے حوالے سے اور یاد آتا ہے کہ روزنامہ قومی آواز (ممبئی) میں بھی انہوں نے کام کیا تھا۔ اس اخبار کے عملے میں کچھ صحافی دہلی دفتر سے آئے تھے جن میں بعض غیر مسلم حضرات بھی تھے۔ ایک دِن کاتب اور دیگر حضرات دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھا رہے تھے۔ ہمارا دوسرا یا تیسرا دِن تھا۔ دیکھا کہ باتھ روم کے پاس تشنہ صاحب کہیں ایک کونے میں سر جھکائے روٹی اور مولی کے کباب کھا رہے ہیں ہم انھیں وہاں سے اٹھا کر اپنے ٹیبل پر لائے اور ساتھیوں سے کہا کہ آپ اپنے سینئر ساتھی مقبول احمد تشنہ کو یوں نظر انداز کرتے ہیں؟۔۔۔

کسی نے جواباً کہا: ہم تو اِنہیں ایم اے کرشنا سمجھ رہے تھے کہ شاید یہ شا کا ہاری ہوں۔

یہ سطریں لکھتے وقت تشنہ صاحب کا ایک شعر حافظے کے آئینے میں جلوہ نما ہے:

بھنور میں جس نے مجھے ڈوبتے ہوئے دیکھا
وہ موج آج بھی ساحل پہ سر پٹختی ہے

رفیع خان نیازی بھی ایک دِلچسپ صحافی کے طور پر مشہور تھے، ان کی ہمہ جہت کتب بینی کا چرچا ایک دنیا میں تھا کسی زمانے میں انقلاب میں کئی کنوارے تھے، جس میں سرِ فہرست تھے ایس ایس جعفری، پھر رفیع خان، سید محمد عباس، شمیم خان اور حسن عالم رضوی۔

ایس ایس جعفری تو دنیا میں جیسے آئے تھے ویسے ہی رخصت ہو گئے، رفیع خان کے سر پر سہرا تو نہیں دیکھ سکے البتہ ان کے جھری آثار چہرے پر آج ساٹھے پاٹھے میں بھی شادی کے نام پر ایک سرخی ہم لوگ ضرور دیکھ لیتے ہیں اور حضرتِ عباس کے بارے میں تو یوں ہے کہ شاید انہوں نے کسی سے وعدہ کر لیا تھا کہ تمہارے بغیر کنوارا ہی مروں گا۔ سو، سید محمد عباس ہیں اور ان کی وفا، یعنی وفائے عباس کا علم آج بھی یوں ہی بلند ہے۔

ممبئی کے ایک مشہور افسانہ نگار ساجد رشید بھی اس کا حق رکھتے ہیں کہ ان کا بھی یہاں تذکرہ ہو، ہمارا حافظہ جہاں تک ساتھ دے رہا ہے یہ مرحوم روزنامہ انقلاب میں ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے سامنے آئے تھے۔ شعرٹون کے نام سے اتوار کو ان کا فن پارہ شائع ہوتا تھا۔ ہمارے ناقص علم کے مطابق کارٹون اور شعر کے اس آمیزے کے بانی وہاب حیدر تھے۔ جن کے کارٹون بھی کسی زمانے میں شعر پہ شوشہ کے زیرِ عنوان انقلاب ہی میں شائع ہوتے تھے، بالخصوص غالب کے

اشعار پر ان کے بنائے ہوئے کارٹون خاصے مقبول ہوئے۔ ان موصوف کے کارٹونوں کا ایک مجموعہ بھی (غالباً حیدر آباد۔دکن سے) طبع ہوا ہے۔

ساجد رشید نے اس روایت کی اپنے انداز سے تجدید کی ۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کے بنائے ہوئے شعرٹون دلچسپ ہوتے تھے۔اس وقت ان کا بنایا ہوا ایک شعرٹون جو پروفیسر فضیل جعفری کے ایک شعر کے ساتھ منظر عام پر آیا تھا۔ظاہر ہے کہ وہ کارٹون تو اِس وقت نہیں ہے مگر فضیل جعفری کا شعر ضرور حافظے میں ہے جو یوں ہے:

آنسو بچا کے رکھیں گورنر ، میئر ، وزیر
برسات میں گریں گی ہی دو چار بلڈنگیں

ساجد رشید نے صحافت میں باقاعدہ کب سے کام شروع کیا یہ تو یاد نہیں مگر روزنامہ اردو ٹائمز ہی ہے جس سے وہ نمایاں ہوئے۔اتوار کو ان کا کالم زندگی نامہ عوام میں بہت مشہور رہا۔ بلکہ ان کے کالموں کا ایک مجموعہ بھی اسی نام سے شائع ہو چکا ہے۔ریت گھڑ یسے موسوم، مرحوم کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی ہمیں یاد ہے۔ مسلمانوں کے عام روِیے سے ساجد رشید بہت خائف رہتے تھے۔

کبھی کبھی یہ رجحان شدت بھی اختیار کر لیتا تھا تو وہ اپنے آپ کو مذہب سے دور جتلاتے تھے اور عام گفتگو میں اعلان کرتے تھے کہ میں اتھسٹ ہوں۔مگر ہم نے کچھ لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ وہ جمعے کی نماز کی پابندی بھی کرتے تھے۔مگر تاریخِ اسلام کے بعض کمزور پہلوؤں پر ان کی تنقید ہی نے ان کے بارے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو بدگمان نہیں بدظن کیا اور اس بدگمانی کی تردید کے بجائے ان کی طرف سے کچھ منفی شدت ہی سامنے آئی۔ بدنامِ زمانہ بنگلہ دیشی قلم کار تسلیمہ نسرین جب ممبئی آئی تو اس کے خیر مقدم کیلئے ساجد رشید بھی موجود تھے۔ اخبارات میں چھپی ہوئی یہ خیر مقدمی تصویر راقم نے بھی دیکھی ہے۔ایسی ہی کئی باتیں ہیں جو عام مسلمانوں میں ان سے بدظنی کا سبب بنیں۔

صاحبانِ اردو ٹائمز کی اِطلاع کے مطابق انہوں نے منصوبہ بند طریقے سے اردو ٹائمز سے علاحدگی اختیار کی اور جواباً ایک روزنامہ اپنا اخبار نکالا۔ جو چند ماہ ہی جاری رہا۔

کسی وقت کی ان کی ایک زیادتی کے نتیجے میں روزنامہ انقلاب میں وہ معتوب قرار پائے اور اِنقلاب ہی کیا اردو ٹائمز میں بھی ان کا نام تک چھپنے پر اِمتناع تھا۔

وہ ہندی زبان سے بھی شغف رکھتے تھے، ممبئی سے مہانگر نامی ہندی کے ایک دینک اخبار

سے وہ وابستہ ہوئے مگر وہاں بھی ان کی بہت دن نہیں نبھی۔ ایک مدت وہ اخباری دنیا سے دور رہے۔ ظاہر ہے جس کا احساس انھیں بھی رہا۔

جب امان عباس (لکھنو) کے روزنامہ صحافت نے ممبئی میں ڈول ڈالا تو یہ بتانا مشکل ہے کہ صحافت کی وہ ضرورت تھے یا روزنامہ صحافت ان کی ضرورت بن گیا۔ مگر ہوا یہ کہ ریزیڈنٹ ایڈیٹر کے طور پر ممبئی کے آسمانِ اردو صحافت پر ان کا ستارہ پھر چمکا اور خوب چمکا جیسے وقتِ آخر چراغ خوب روشن ہوتا ہے۔

دِل کی خرابی کے سبب وہ ہسپتال داخل ہوئے آپریشن ہوا، ایسے آپریشن نجانے کتنے مریضوں کے روز ہوتے رہتے ہیں مگر اس آپریشن کے بعد کسی وقت وہ کومہ میں چلے گئے اور پھر ایک دِن وینٹی لیٹر کو ان کے جسد سے ہٹا لیا گیا، نتیجے میں ان کی سناونی دور تک پہنچی۔ شکر ہے کہ جن اخباروں میں ان کا نام تک نہیں چھپتا تھا ان اخباروں نے بھی ان کی خبر چھاپی۔ ساجد رشید کی عمر جانے کی تو نہیں تھی مگر جانا تو سب کو ہے کون کب جائے گا کس کو پتہ۔۔۔!

یاد آتا ہے کہ 1970 کے آس پاس کسی زمانے میں انہوں نے (غالباً ویکلی) وقت کے نام سے بھی ایک میگزین نما اخبار جاری کیا تھا۔ مگر ان کا ادبی سہ ماہی نیا ورق تمام ادبی دنیا میں مشہور ہوا۔ ان کے لائق فرزند شاداب میاں نیا ورق کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

وہ کس درجے کے افسانہ نگار تھے، ان کی افسانہ نگاری کو ان کی صحافت نے تقویت پہنچائی ؟
یا ان کی صحافت نے انھیں مشہور کیا۔۔۔؟

یہ سوال کرنے والے کرتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ممبئی میں نجانے کتنوں کیلئے بھائی ثابت ہوئے۔ ایک بات یہاں لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ کسی پر بھی اپنی جارح تنقید کو حق سمجھتے تھے مگر اپنے معاملات میں وہ بہت نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ ہم سنی سنائی نہیں بلکہ اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ انقلاب میں جب ہم نے ادبی رسائل کے سرورق کی تصویر کے ساتھ جرائد کا باقاعدہ تعارف کا سلسلہ شروع کیا تو ایک بار ان کے پرچے نیا ورق پر اپنا تاثر لکھتے ہوئے کچھ لکھ گئے تو جواباً ان کا جو تاثر تھا وہ اتنا شدید تھا کہ جیسے ہم نے ان کے کسی زخم پر نمک رکھ دِیا ہو۔ ہر چند کہ وہ دو تین جملے ہی تھے اور بہت سادہ بھی مگر۔۔۔!

معاملہ یہ تھا کہ سہ ماہی نیا ورق کا ہر نیا شمارہ ہمارے پاس (ممبئی کے مشہور افسانہ نگار اور ہمارے مشترکہ دوست) عبدالعزیز خان دے جایا کرتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ساجد رشید اسے بھجواتے ہیں

مگر ہمارے مذکورہ تبصرے کے بعد معلوم ہوا کہ نیا ورق وہ نہیں بھجواتے تھے بلکہ بھائی عبد العزیز خان اپنے طور پر ہمیں دے جایا کرتے تھے۔ ساجد رشید نے ان سے کہا کہ اب ندیم صدیقی کو میرا پرچہ (نیا ورق) نہ دینا۔ (راوی یعنی عبد العزیز خان ابھی زندہ سلامت اس واقعے کے گواہ ہیں)۔

ان سب باتوں سے قطعِ نظر ممبئی کی اردو صحافت میں ساجد رشید کا اپنے وقت میں ایک نمایاں کردار واضح ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

محمد عالم نقوی (نصیر آبادی / لکھنوی) 1990 میں انقلاب کے (اول و آخر) اسسٹنٹ ایڈیٹر بنے مگر کام نیوز ایڈیٹر کا سونپا گیا۔ موصوف اپنا کام بڑی محنت اور یکسوئی سے کرتے تھے۔ سنڈے میگزین میں خاص مضمون بھی لکھتے تھے۔ شریف النفس عالم نقوی کے مزاج کی تندی کا نتیجہ ایک دن یہ نکلا کہ وہ انقلاب سے مستعفی ہو گئے۔

کئی برس لکھنو میں بے کار بیٹھے رہے، پھر یوں ہوا کہ روز نامہ اردو ٹائمز کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر بن کر ممبئی لوٹے اور کوئی دس برس اِس اخبار کی پریس لائن میں ان کا نام ایگزیکٹیو ایڈیٹر کے طور پر چھپتا رہا اور یکم مئی 2011 کو وہ پھر لکھنو واپس ہو گئے۔ جہاں روز نامہ اودھ نامہ کے گروپ ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں (واضح رہے کہ اودھ نامہ روزانہ 16 صفحات پر مشتمل یو پی کے کئی شہروں ہی سے نہیں ممبئی سے بھی شائع ہو رہا ہے۔) اردو ٹائمز کا اداریہ پڑھنے والوں کا ایک طبقہ ان سے شاکی رہتا تھا کہ وہ ہر مسئلے کو یہودیوں / صیہونیوں سے جوڑ کر اپنی بات کو قرآنِ کریم سے مدلل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ حجتِ قرآن کے بعد قاری کچھ سوچنے نہ پائے۔ ایک محفل میں موصوف نے اس اعتراض کا یوں جواب دِیا: ذرا کوئی بتائے کہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالی نے کس قوم کا سب سے زیادہ ذِکر کیا ہے اور کس طرح کیا ہے؟۔۔۔ ان کے اِس جواب پر مجمع میں بیٹھے ایک شناسا کی یہ سرگوشی بھی سنی گئی:

اپنی کمزوری کو قرآن کریم سے مستحکم کرنے کی کیا عالمانہ سعی ہے۔

جس پر حضرتِ عزازیل کو بہت خوشی ہوئی ہوگی۔

عالم نقوی اپنے دور میں ممبئی کی اردو صحافت میں اسلامی فکر کے حامل واحد صحافی سمجھے جاتے تھے، جن سے اختلاف تو ممکن تھا مگر ان کے خلوص اور نیت پر شک کسی کفر سے کم نہیں۔ ہم جب عالم نقوی کو ذہن میں رکھ کر سوچتے ہیں تو ممبئی کے قلم پیشہ لوگوں کو گننے کے لئے ہمارے ہاتھ کی پانچ انگلیاں

زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ کیا یہ بات کسی اعزاز سے کم ہے کہ ان کی تحریریں، اداریے اور مضامین وغیرہ کی شکل میں آج بھی اردو ٹائمز کے بعد اب ممبئی اردو نیوز میں بہ اہتمام شائع کی جارہی ہیں۔

اردو ٹائمز کے موجودہ ایگزیکٹیو ایڈیٹر عبدالرحمان صدیقی (کانپوری) بھی انقلاب میں ہمارے ساتھی رہ چکے ہیں ان موصوف پر ہر فن مولا صحافی کا جملہ فٹ ہوتا ہے ان کی ہینڈ رائٹنگ بھی عجب تھی (ہے) کاتب عرفان علوی ان کے مسودے پر پہلے تین بار سورہ اخلاص پڑھتے تھے پھر کتابت کرتے تھے۔ وسیم انصاری، حسنِ عالم رضوی، جاوید جمال الدین، ظفر زاہدی، شمیم خان، ریحانہ شیخ، جہانگیر کاظمی، شکیل رشید، سعید حمید، مشتاق علی، سید ظہیر الدین، ساجد خان، عظمت اللہ صدیقی، اِرتضی نشاط اور عرفان عثمانی وغیرہ بھی اپنے قلم کی روشنائی سے انقلاب کو روزانہ اسمِ بامسمّٰی بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ جس طرح برادرم شاہد لطیف کے نمک پارے اب بھی قارئین کو یاد آتے ہیں (اب یہ عزیزم اس اخبار کے مدیرِ محترم ہیں) اسی طرح عرفان عثمانی کی ایجاد رمضان ڈائری بھی لوگ بھولے نہیں۔ انقلاب کے ہماری آخری دِنوں میں فاروق انصاری (کیرم باز)، عبدالحئی، حافظ سعید خان، کاظم شیخ، ندیم عصران، اُقبال انصاری، رئیسہ منور، شیرین عثمانی، وغیرہ بھی شعبہ ادارت میں شامل کر لی گئی تھیں اور بھیونڈی کے قطب الدین شاہد، عاصم جلال، محمد حبیب ابنِ ایم اے تشنہ، شہاب انصاری، مبشر اکبر، ارقم مومن، فرزانہ انصاری، عبد الکریم قاسم اور نادر جیسے نوجوان روزنامہ انقلاب کے جسد میں تازہ خون کی مانند دوڑ رہے ہیں۔

سومناتھ مندر والے پٹن کے اقبال پٹنی کا بھی ذکرِ جلی ضروری ہے یہ موصوف تصحیح نگاری پر مامور تھے اور صرف کتابت کی غلطیاں نہیں پکڑتے تھے بلکہ ان کی نظر اور دماغ دونوں کام کرتے تھے، بظاہر ممکری آرٹسٹ اقبال پٹنی ذہین وفطین تھے جملے بازی میں ان کا جواب کم از کم انقلاب میں تو نہیں تھا۔ ان کے طنزیہ جملے مہینوں گونجتے رہتے تھے۔ پٹنی جب کسی ساتھی کی کسی غلطی پر ناراض ہوتے تو کہتے تھے کہ انقلاب کی تاریخ میں آپ کا نام ضرور لکھا جائے گا۔۔۔ اور کچھ توقف کے بعد تاسف بھرے لہجے میں کہتے مگر افسوس کہ انقلاب کی تاریخ۔۔۔ تو لکھی ہی نہیں جائے گی۔ !

ایک بار کتابت شدہ اداریہ لئے ہوئے جس میں ایک لفظ (مطمحِ نظر) کا اِملا غلط لکھا ہوا تھا، مدیرِ محترم کے پاس پہنچے جو بھی ان کے استادرہ چکے تھے۔ سر۔۔۔ سر!۔۔۔ اِس لفظ کا اِملا کیا ہے؟ ۔۔۔ اقبال پٹنی کے سر نے جواب دیا:۔۔۔ مطمع نظر۔۔۔ مدیر موصوف کے پاس ہمارے ایک

سینئر ساتھی بھی بیٹھے ہوئے تھے، ان سے مدیر موصوف نے پوچھا کہ بھئی آپ بتائیں؟ انہوں نے فوراً سے پیشتر سر کے سر میں سر ملاتے ہوئے کہا: آپ صحیح املا بتا رہے ہیں۔۔۔ مطمع نظر۔۔۔ ہی صحیح ہے۔

اب اقبال پٹنی کی رگِ ظرافت پھڑ کی ایسا ہے تو پھر اس کے معنی ہوئے طمع کی نظر۔۔۔ دونوں حضرات کا جواب تھا: ہاں ہاں یہی صحیح ہے۔ اب اقبال پٹنی نے لغت اٹھایا تو اس میں اصل املا (مطمحِ نظر) دیکھ کر دونوں حضرات ایک دوسرے سے منہ چھپانے لگے اور پٹنی صاحب اپنا تکیہ کلام ۔۔۔ فوٹو کہیں کے بدبداتے ہوئے ایڈیٹر کے کیبن سے باہر نکل لئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے کام میں طاق تھے اکثر لوگ اخبار میں پروف ریڈنگ کے کام کو سب سے نچلا درجہ دیتے ہیں۔ اقبال پٹنی کا یہ جملہ اس وقت یاد آتا ہے:

کام کام ہوتا ہے۔ کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔

سوئی کی جگہ سوئی ہی کام کرتی ہے، توپ نہیں اور توپ کی جگہ سوئی کا کیا کام؟!

اِنقلاب میں ڈاکٹر ظ انصاری کی، دوسرے دور کی ادارت سال بھر کی مدت بھی پوری نہ کرسکی مگر اس حقیر کی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ انقلاب کے قارئین صفحہ اول پر شاہ سرخی کے بعد جو چیز سب سے پہلے پڑھتے تھے وہ صفحہ 3 پر ظ انصاری کا ایڈیٹوریل ہوتا تھا۔ ہم نے اپنے دور میں کسی مدیر کے اداریوں کا مجموعہ دیکھا ہے تو وہ یہی ڈاکٹر ظ انصاری ہیں کہ انقلاب کے اداریوں کا ایک انتخاب کانٹوں کی زبان کامٹی (ناگ پور) کی بزمِ غالب نے ظ صاحب کی حیات ہی میں چھاپ دِیا تھا۔ انقلاب میں ان کے بعد اگر کوئی باوقار علمی تشخص کی حامل شخصیت کرسی ادارت کو نصیب ہوئی تو وہ دورِ جدید میں اردو کے ممتاز نقد و ادیب پروفیسر فضیل جعفری ہیں۔

انھیں بھی یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ انھیں باعزت طریقے سے بلا کر دوسری بار ادارت کی ذمہ داریاں دِی گئیں۔ ان کے دونوں دور کا انقلاب بھی ایک انقلاب ہی ثابت ہوا۔ پروفیسر فضیل جعفری کے اداریوں کو بھی مہاراشٹر کے اردو قارئین میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

راقم السطور کے پاس باقاعدہ مرتب کیا ہوا ان کے اداریوں کا ایک انتخاب موجود ہے جس میں (1992 سے 2004 تک) مسلم دنیا کے حالات و واقعات موضوع بنے ہوئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر فضیل جعفری کے یہ اداریے ایک خاص دور کی تاریخ ہیں۔ کاش کوئی صاحب، انھیں کتابی شکل میں چھاپ دیں تو یہ اداریے آئندہ نسل کیلئے ایک روشن سبق بن سکتے ہیں۔

آر کے کرنجیا کا اردو بلٹز بھی ممبئی کے اخبارات میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ منیش سکینہ، انور عظیم، اختر حسن (حیدر آبادی) اور حسن کمال وغیرہ کی ادارت نے اسے اردو کے ہفتہ وار اخبارات میں اول اول مقام پر پہنچا دیا تھا۔ یہی وہ ہفت روزہ ہے جس کا آخری صفحہ خواجہ احمد عباس جیسے ممتاز ادیب و فلم ساز کی تحریر کی وجہ سے اول صفحے سے زیادہ مقبول تھا۔ اردو بلٹز ہی نے ہارون رشید علیگ جیسا خوبصورت صحافی اردو کو دیا۔ وہ بھی انقلاب کے مدیر بنائے گئے۔ روزنامہ انقلاب کی 22 سالہ ملازمت میں ہم نے چھ مدیروں کی معیت میں کام کیا۔ کسی ایڈیٹر کی رحلت پر ہم رنج و غم کی کیفیت سے دوچار ہوئے تو وہ ہارون رشید علیگ تھے۔ واضح رہے کہ شمیم زبیری، ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور ریاض احمد خان کا اِنتقال اِنقلاب کی ادارت سے علیحدگی کے بعد ہوا۔ پروفیسر فضیل جعفری کی عمر میں اللہ صحت کے ساتھ برکت دے اور عزیزم شاہد لطیف کی عمر تو انشا اللہ بڑھتی ہی رہے گی۔

ہارون رشید علیگ خوب شخص تھے فلموں کے بارے میں ان کی معلومات مشہور تھیں۔ اِنقلاب کے دورِ ادارت کے ابتدائی ایام میں وہ ہم سے کچھ قریب تھے کسی رفیقِ کار کو یہ قربِ لطیف کھٹکا تو انہوں نے ہارون رشید کے کان بھرے کہ ندیم صدیقی کچھ نہیں جانتے (کہنے والے نے کہا تو سچ ہی تھا)۔ انقلاب کے اندرونی صفحات ہماری نگرانی میں مرتب ہوتے تھے ایک دن ہم صفحات بنوا رہے تھے پیچھے سے ہارون رشید نے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور ہم سے پوچھا: ندیم ! فلم مرزا غالب کس نے لکھی تھی؟ ۔۔۔ فوری طور پر ہمیں جواب نہیں سوجھا تو ہم نے کہا: نہیں معلوم ۔۔۔ ہارون رشید نے ہمارا کاندھا دبا کر کہا کہ سعادت حسن منٹو نے فلم مرزا غالب لکھی تھی۔

جس پیج میکر سے ہم اخبار کے صفحات بنوا رہے تھے، وہ (ندیم عصران) ہمارا بھتیجا تھا۔ ہماری انا نے تصور میں سر اٹھایا کہ بچوں کے سامنے امتحان لیتے ہو، ۔۔۔ ہارون صاحب ! اللہ نے چاہا تو پھر کسی وقت حساب ہو جائے گا۔

دو تین دن بعد ہم حسبِ معمول شام کو دفتر آئے تو موصوف اپنے ایر کنڈیشنڈ کیبن میں قیلولہ کی حالت میں تھے۔ ہم نے آدھا دروازہ کھولا اور اندر گردن ڈالی اور زور سے سلام کیا، پھر عرض کیا: ہارون صاحب ! ذرا بتائیں تو سعادت حسن منٹو نے ایک فلم میں کردار بھی ادا کیا تھا یعنی فلم میں ایک پاگل کا رول کیا تھا۔ اس فلم کا نام کیا تھا؟

موصوف ایک لمحے کیلئے تو خاموش رہے، جب انھیں کچھ نہیں سوجھا تو چپ چاپ نفی میں گردن

ہلا دی۔۔۔ہم نے کہا: فلم کا نام تھا:۔۔۔آٹھ دن۔۔۔جس میں سعادت حسن منٹو نے ایک ایسے نیم دیوانے کا کردار ادا کیا تھا، جس کے ہاتھ میں ایک گولہ ہے اور وہ اسے ایٹم بم بتاتا ہے اور بار بار دھمکی دیتا ہے کہ کہو تو ایٹم بم ماردوں۔۔۔!

ہارون رشید نے کہا: آپ نے کہاں پڑھا؟

ہم نے ہنستے ہوئے کہا کہ اسی اخبار (انقلاب) میں جس کے آپ مدیرِ محترم ہیں۔

پھر انہوں نے سوال کیا کہ کب اور کس کے مضمون میں؟

ہم نے کہا: پانچ دِن قبل (روزنامہ انقلاب میں) انتظار حسین کا مضمون میں اور کہانی کے بیچ چھپا تھا اسی مضمون کے آخری حصے میں یہ بھی درج ہے۔

ہارون رشید: (ہنستے ہوئے)۔۔۔ارے واہ

ہم نے بھی اپنی بتیسی دِکھائی اور کیبن کا دروازہ بند کر دِیا۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تمام باتیں ہمارے کسی بھی ساتھی نے نہیں سنیں۔

غازی پور (یو پی) کے ہارون رشید اردو صحافیوں میں اپنی پرسالٹی میں لاجواب تھے جو لباس زیب تن کرلیں وہ ان پر بجتا تھا۔ ایک شام وہ شیروانی پہنے ہوئے دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ سب کی نظریں ان پر پڑیں تو وہ مسکرائے اور ہم نے ان سے پوچھا کہ مغلِ اعظم کے صاحبِ عالم آج کس محفل کو بے رونق کر کے لوٹے ہیں۔۔۔ ہمارے اس جملے پر ہارون رشید کھِل اٹھے: ارے ندیم! فلاں کمپنی نے ایک پرفیوم بنایا ہے:۔۔۔مہکا کریں گے ۔۔۔۔اسی کی تقریب تھی لتا بائی کے ہاتھوں اس پرفیوم کو لانچ کیا گیا اور پورے پروگرام میں فلم ممتا کا گیت لتا بائی کی مدھم آواز میں گونجتا رہا۔ کیا شاندار تقریب سجائی تھی پرفیوم والوں نے۔۔۔

یہ کہہ کر وہ اپنے کیبن میں تقریب کی رپورٹ لکھنے بیٹھ گئے۔

رِپورٹ کی کمپوزنگ ہوئی اور صفحہ اول کی اینکر اِسٹوری کے طور پر لگ گئی۔ کچھ دیر میں پیسٹنگ ٹیبل پر جب ہم پہنچے تو مذکورہ رِپورٹ کی سرخی میں ایک غلطی نظر آئی تو ہم نے پیج میکر سے اس کی تصحیح کے لئے کہا تو اس نے ہماری بات سنی ان سنی کی، ہم نے دوسری بار کہا مگر پھر وہی سنی ان سنی۔۔۔دراصل ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہمارے پیچھے ہارون رشید کھڑے ہیں جبکہ پیج میکر انھیں دیکھ چکا تھا۔ اب ہارون رشید کی آواز آئی: کیا بات ہے ندیم؟۔۔۔تو ہم نے کہا: سرخی میں غلطی ہے۔

ہارون رشید:۔۔۔کیا غلطی ہے؟

ہم نے سرخی کی طرف اشارہ کیا جو یوں تھی:

پرفیوم۔۔۔۔رہے نہ رہے ہم مہکا کریں گے۔۔۔کا لتا منگیشکر کے ہاتھوں اِجرا۔

ہم نے کہا کہ یہاں۔۔۔ رہے نہ رہے ہم۔۔۔نہیں۔۔۔رہیں نہ رہیں ہم۔۔۔ہونا چاہئے۔

ہارون رشید: اماں ! تمہیں تو زبان کا مالی خولیا ہو گیا ہے، جو میں نے لکھا ہے، وہی صحیح ہے۔

ہم نے کہا: نہیں۔۔۔رہیں نہ رہیں۔۔۔۔۔صحیح ہے۔

جب بات بڑھی تو ہم نے ہنستے ہوئے کہا: ہارون صاحب ہوڑا دور نہ میدان مجروح صاحب کو فون کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ انہوں نے اِس گانے میں رہے۔۔لکھا ہے۔۔یا۔۔رہیں۔ ؟

ہارون رشید:۔۔۔ہاں ہاں کرو فون۔۔۔!

اب ہم نے کہا:۔۔۔پہلے ایک شرط!

ہارون رشید:۔۔۔وہ کیا؟۔۔۔ہم نے پھر ہنستے ہوئے کہا جو غلط ثابت ہو اس کی طرف سے ایک کیلو مٹھائی۔۔۔!!

ہارون رشید: ہاں ہاں۔۔۔!

مجروح صاحب سے فون پر بات ہوئی تو انھوں نے اس گانے کے لکھنے سے لے کر ریکارڈنگ تک کی روداد سناتے ہوئے کہا:۔۔۔میاں!۔۔۔رہیں نہ رہیں ہم مہکا کریں گے

ہارون رشید نے سرخی دوبارہ کمپوز کرائی اور دوسرے دِن تمام ساتھیوں کو مٹھائی بھی کھلائی۔

ہارون رشید شوگر کے مریض تھے۔عید کی نماز پڑھنے انجمن اسلام گئے اور وہاں ایک ٹھوکر نے ان کے انگوٹھے کو زخمی کر دِیا۔سچ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی ٹھوکر اپنا کام کر جاتی ہے۔انگوٹھے کے زخم نے بڑھنا شروع کیا اور پھر مرض نے دِل کو بھی اپنا نشانہ بنایا تو بالآخر ایک دِن جسلوک ہسپتال سے ان کی خبر دفتر انقلاب پہنچی۔اس وقت بھی لتا کی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہوئی تھی اور یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی کہ ۔۔۔ رہیں نہ رہیں ہم۔۔۔مہکا کریں گے

بن کے کلی، بن کے صبا،۔۔۔باغِ وفا میں

☆☆☆

ایک ایسی بات رہی جاتی ہے جو نہ لکھوں تو کم ظرف کہا جاؤں 1982 میں جواہر لعل نہرو اور حیات اللہ انصاری جیسے اکابر کی یادگار روزنامہ قومی آواز ممبئی سے خلیل زاہد کی سربراہی میں جاری ہوا تھا اور خوب چلا مگر اسکی عمر دو برس بھی پوری نہیں ہوسکی۔ مگر اس اخبار نے شہر کے دوسرے اخبارات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا ہفت روزہ تو اپنی مثال آپ تھا جسے خان ارمان مرتب کرتے تھے۔ سعید حمید جو اس وقت تک سعید نشتر ہوتے تھے اسی اخبار سے نمایاں ہوئے اور اب راشٹریہ سہارا (ممبئی) کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔ (یہ کتاب پریس میں جارہی تھی تو پتہ چلا ہے کہ موصوف راشٹریہ سہارا سے مستعفی ہوچکے ہیں)۔

خلیل زاہد ہماری معلومات کے مطابق انقلاب ہی سے سامنے آئے اور پھر دہلی ریڈیو پر چلے گئے اور وہیں سے روزنامہ قومی آواز لیئے ہوئے بمبئی لوٹے۔ قومی آواز کے بعد انہوں نے۔۔۔ اشتیاق خان (مالک) اور عبداللہ کمال (مدیر) کے کئی برس قبل بند ہونے والے ویکلی اخبار عالم کا ٹائٹل خرید کرا سے پھر زندہ کیا۔ اس وقت بدنامِ زمانہ تحریک خالصتان کے بھنڈران والا کا اِنٹرویو لینا ایک بڑی اور جرات مندانہ بات تھی۔ بلکہ اس انٹرویو ہی نے خلیل زاہد کو اردو صحافت میں خلیل زاہد کا تشخص دیا۔

ابھی اوپر اشتیاق خان کا ذکر ہوا ہے یہ موصوف بھی اپنے وقت کے ایک کردار تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ جسے مجاز لکھنوی نے لکھا ہے اس کی موسیقی اِنہی خاں صاحب کے ذہن ترنم خیز کا نتیجہ تھی، ان موصوف کو اداکاری سے بھی شغف تھا اپنے وقت کی مشہور فلم شطرنج کے کھلاڑی میں ایک کردار انہوں نے بھی ادا کیا تھا۔

صوری طور پر انقلاب کو ہمیشہ ایک امتیاز حاصل رہا ہے، مگر ممبئی میں اردو کمپیوٹر کے ذریعے کتابت میں چھپنے والا پہلا اخبار روزنامہ اردو ٹائمز ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی لکھنے کی ہے کہ 20۔22 سال قبل روزنامہ انقلاب دہلی سے بھی جاری ہوا تھا اسی طرح بنگلور سے اس کا ایک ہفت روزہ ایڈیشن (ٹیبلائڈ سائز) بھی منظر عام پر آیا۔ مگر دونوں ایڈیشن زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکے۔

اسی طرح روزنامہ اردو ٹائمز نے بھی لکھنو ایڈیشن کا ڈول ڈالا تھا، جب کہ اس کا ایک مقامی دفتر بھی لکھنو میں سید حسین افسر کی نگرانی میں قائم ہوگیا تھا مگر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ اردو ٹائمز کے دہلی ایڈیشن کا منصوبہ بھی بنایا گیا مگر اس کے ذہین اور جواں سال ایک پارٹنر معین احمد کی ناگہانی

موت نے اس منصوبے کی بھی عملی شکل نہیں بننے دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ممبئی کے دو مرحوم صحافی بھی اس وقت اپنی آنکھیں ہمیں دِکھا رہے ہیں کہ ہمیں کیوں بھول رہے ہو؟۔۔۔ یہ حضرات مرحوم تو ہیں مگر اِن کی اموات فطری نہیں بلکہ ظالمانہ قتل کا نتیجہ تھیں۔ سب سے پہلے تو سردار عرفان کا ذکر ہوگا کہ یہ موصوف پوری صحافتی برادری میں پراسرار شخصیت سمجھے جاتے تھے یہ بھی کنواروں کی فہرست میں شامل تھے، سیلف میڈ سردار عرفان کا جب قتل ہوا تو وہ انقلاب سے وابستہ تھے اور مہاراشٹر اردو اکادمی کے افسر اعلیٰ کے منصب سے مستعفی ہوئے تھے۔ چار پانچ دِن بعد باندرہ میں واقع جب ان کے فلیٹ سے بدبو پھوٹنا شروع ہوئی تو پڑوسیوں نے پولس کو خبر دِی۔

ہمارے ایک سینئر صحافی کا بیان ہے کہ وہ بھی پولس کے ساتھ اس وقت ان کے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے۔ بتاتے ہیں کہ ان کے دونوں پیروں پر جب ان کی نظر پڑی تو محسوس ہوا کہ مقتول نے سفید موزے پہن رکھے ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ سفید کیڑوں نے ان کے پیروں کو کھانا شروع کر دِیا تھا ان کی موت پر لوگوں نے ان کے اسرار کو بنیاد بنا کر نجانے کتنے قصے گڑھ لئے تھے پولس کی تحقیق کے بعد قصہ گو حضرات کو منہ کی کھانی پڑی۔ ان کے کسی رشتے دار لڑکے نے، جو ان سے کچھ رقم کا طالب تھا اور انہوں نے اِس بار رقم دینے سے انکار کر دِیا تھا، قریب رکھے ہوئے کرکٹ کے بلے سے ان پر حملہ کر دِیا۔ بلے کا وار اتنا شدید تھا کہ وہ وہیں جاں بحق ہوگئے اور وہ لڑکا حواس باختہ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے یہ جا اور وہ جا۔۔۔ مرحوم سردار عرفان دوردرشن پر ایک پروگرام کہکشاں بھی پیش کرتے تھے۔ مرحوم بھی صحافت میں ہر فن مولا تھے، کتابت کی باریکیوں سے لے کر ترجمہ نگاری اور کاپی جوڑنے میں بھی وہ ماہر سمجھے جاتے تھے۔ افسوس آج ان کا نام لینے والا کوئی نہیں۔

اقبال ناطق ہفت روزہ رازدار کے ایڈیٹر تھے، تیز طرار قسم کا یہ نوجوان ایک بار مسلمانوں کے علاقے سے پارلیمنٹ کے الیکشن میں بھی امیدوار بنا تھا۔ روایت ہے کہ ممبئی کے غنڈوں نے ماہم کی کھاڑی میں اردو کے مشہور لکھاڑ صحافی سلامت علی مہدی کے داماد اقبال ناطق کے ایک ایک کر کے اعضا کاٹے تھے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اقبال ناطق کا قتل ممبئی کی گینگ وار کی ابتدا تھی۔ مگر یہ تو سچ ہے کہ اقبال ناطق ممبئی میں اور بالخصوص ہمارے دور میں اردو کا پہلا صحافی تھا جس کا بہیمانہ قتل کیا گیا تھا۔

اردو اخبارات میں قطعہ نگاری یا ہزل کا سلسلہ تقریباً ہر دور میں رہا ہے ممبئی کے اخبارات میں مختلف

شعرا اپنے مزاحیہ وطنزیہ شعری تیر وتفنگ سے قارئین کو داد دینے پر مجبور کرتے رہتے تھے۔ جن میں علامہ درپن، علامہ ہرفن، علامہ ورشن، علامہ بے نام، عبداللہ ناصر، چرو ٹ باز، علامہ قطب مینار اور میاں بھائی وغیرہ کے نام اِس وقت یاد آتے ہیں۔ ان کے یہ دو شعر بھی ہی کو نہیں بہت سوں کو یاد ہیں:

ان کے بدلے ان کی ماں سے کہہ گئے افسانہ ہم　　رات جالی میں اندھیرا تھا حماقت ہو گئی

(سعید رضا علامہ درپن)

ہر روز ایک دانت اکھڑتا چلا گیا　　رونٹھی جوانی حسن بگڑتا چلا گیا

(ریاض جزولی علامہ ہرفن)

اخبار کی قطعہ نگاری اپنے آپ میں کسی بھی نازک فن سے کم نہیں کہ اس کی عمارت کی بنیاد چوتھا مصرعہ ہی ہوتا ہے۔ جو یہ چوتھا مصرعہ کہہ لیتا ہے وہی کامیاب قطعہ نگار کہلاتا ہے ورنہ اس کا قطعہ، قطعہ نہیں خطا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارے دور میں اب تک اس فن میں جو منزلیں رئیس امروہوی (روزنامہ جنگ، کراچی) نے سر کی ہیں وہ دوسروں کو یا تو ملیں ہی نہیں یا پھر اس بھاری پتھر کو چوم کر لوگ خود پتھر ہو گئے۔

☆☆☆

ممبئی کی سرزمین اردو اور اردو صحافت کے لئے سنگلاخ کبھی نہیں رہی آج اگر اس عروس البلاد سے پانچ روزنامے شائع ہو رہے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ زمانہ گزرے ہوئے بہت بڑی مدت ابھی نہیں گزری جب اسی عروس البلاد سے روزنامہ ہفت روزہ، پندرہ روزہ اخبارات کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنے متنوع ماہنامے بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ جن میں سے اِس وقت ہمارا حافظہ کاغذ پر چند نام منتقل کر رہا ہے۔۔۔ آئینہ (مدیر: ظ انصاری) گفتگو (مدیر: علی سردار جعفری) کاروانِ حیات (مدیر: ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی) بھنڈی بازار (م: محمود سروش) تفنگ (م: نوالکھنوی) اظہار (م: باقر مہدی اور فضیل جعفری (قلم) م: الیاس شوقی (جنگ اور مضمون) م: سردار جوہر امروہوی (اخبار عالم) م: عبداللہ کمال (عکاس) م: امین خطیب (تنویر) م: خلیل احمد صباغی (تنویر ہی کے نام سے اصغری بیگم) مشہور ٹی وی اینکر تبسم کی والدہ (نے بھی کسی وقت ایک جریدہ جاری کیا تھا۔ فلم سنسار) م: ایم عالم (کہکشاں) م: شمیم زبیری (مواخذہ) م: ڈاکٹر داود کشمیری (فن اور شخصیت) م: صابردت بزم فکر وفن) م: قاسم قریشی، رئیس بلوی، قتیل راجستھانی

اور فصیح اکمل قادری (نشاۃ الثانیہ) م: عثمان غنی عادل وغیرہ! لیکن باقر مہدی اور فضیل جعفری کا مجلّہ اظہار، شمس کنول کا گگن، عبداللہ کمال کا گل منظر، عبدالحمید بوبیرے کا ماہنامہ صبحِ امید اور شمیم طارق کا ہفت روزہ ہمعصر ہمارے لئے اردو کے یادگار مجلّے واخبار ہیں۔ جن کی کارکردگی اپنے دور میں اپنی مثال آپ تھی۔

لوگ اپنی کمزور باتیں گول کر جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی ایسی ہی ایک حرکت یہاں درج کرنی ہے، جو یوں تھی: ساتویں دہائی میں ہمیں اخبار نکالنے کا شوق چرایا۔ ڈِکلیریشن کے لیے کئی نام دہلی بھیجے سب سے آخر میں ایک نام بمبئی والا بھی درج کیا گیا تھا۔ ہماری قسمت کہ وہی نام ہمیں الاٹ کیا گیا۔ اب شوق نے اور زور مارا کہ اس کا اِجرا ڈاکٹر ظ انصاری کے ہاتھوں ہو۔ ہم ان کے گھر پہنچے اور گزارش کی۔ پہلے تو انہوں نے ڈانٹا کہ میاں! یہ خوش فہمی تمہیں کیوں کر ہوئی کہ تم اخبار نکال سکتے ہو؟ بہت دیر تک وہ ہمیں اسی طرح کی باتیں سناتے رہے۔ پھر اخبار کا نام پوچھا۔ ہم نے سوچا کہ اگر بمبئی والا بتاتے ہیں تو شاید انھیں اور غصہ آجائے، سو ہم نے اخبار کا نام بمبئی بتایا۔ ہائیں یہ نام تمہیں مل گیا۔۔۔! خیر سے وہ ہمارے اخبار کا اِجرا کرنے کو تیار ہو گئے۔(واضح رہے کسی زمانے میں بابہے کے نام سے ایک ہفت روزہ محمود راہی وغیرہ نکال چکے تھے)

ڈاکٹر ظ انصاری کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ داود فاضل بھائی آڈیٹوریم (کھڑک۔ممبئی) میں وہ آگئے۔ جلسے کی کارروائی شروع ہونے میں کچھ دیر تھی، وہ اگلی صف میں بیٹھے ہوئے تھے، پیچھے کچھ لوگ گفتگو کر رہے تھے کہ ندیم صدیقی کو کوئی نام ہی نہیں سوجھا، بتایئے بمبئی والا۔۔۔ یہ کوئی نام ہوا۔!!

جلسہ شروع ہوا۔ پروگرام کے مطابق انہوں نے اخبار کا اِجرا کیا اور اب وہ تقریر کر رہے ہیں پرانے اخبار اور صحافیوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ انھیں یاد آیا۔۔۔ بمبئی والا۔۔۔ انھوں نے کہا کہ ابھی جلسہ شروع ہونے سے قبل کوئی صاحب ہمارے ندیم سلمہ کے اخبار کے نام پر معترض تھے کہ بمبئی والا کیا نام ہوا؟۔۔۔ ہم ان صاحب سے کہیں گے کہ جس طرح حضرتِ والا، جنابِ والا یا حضور والا ہے۔۔۔ اسی طرح ہے یہ بمبئی والا بھی۔۔۔ یہ بھی اردو ہے اسے قبول کیجیے !!

یقیناً آج ممبئی میں اردو والوں کی آبادی خاصی بڑھی ہے، جو شہر سے مضافات کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئی ہے جن کی تعداد ایک اندازے کے مطابق 40۔۔۔ 50 لاکھ سے کہیں زیادہ

ہے مگر اردو قارئین کی تعداد کی حالت مور کے پاوں جیسی ہی ہے۔ اس شہر سے روزنامہ انقلاب، اردو ٹائمز، راشٹریہ سہارا، ممبئی اردو نیوز، صحافت اور ہندوستان کے بعد کل اگر کوئی ساتواں روزنامہ جاری ہو جائے تو آج ، ان روزناموں کے جو جملہ قارئین ہیں انھیں میں سے نیا اخبار کچھ قارئین توڑے گا، کہنا یہ ہے کہ اردو کی نئی نسل اردو اخبارات سے کوئی قابلِ ذکر دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کرتی جب کہ ایسا نہیں ہے کہ اخبارات نے نئی نسل کو متوجہ کرنے کی کوششیں نہ کی ہوں۔ ہم نے انقلاب کے اپنے آخری دور میں دیکھا ہے کہ اس کے جواں سال مدیر شاہد لطیف نے ہر ممکن کوشش کی اور اپنی مختلف مثبت صلاحیتوں کو استعمال کر لیا مگر جسے قابل ذکر کامیابی کہتے ہیں انہیں بھی نہیں مل سکی اس میں ان کا قصور نہیں، ہم اردو والوں کی ترجیحات کو دخل ہے۔ کہتے ہیں ناامیدی کفر ہے مگر اس ضمن میں ہم جیسے لوگ ناامید نہ سہی مگر مایوسی کے اندھیرے میں ضرور گھرے ہوئے ہیں۔ اردو بلٹز اپنے اشتہارات میں ایک جملہ لکھا کرتا تھا:

یہ وہ اخبار ہے جس کے خریدنے والے ہزاروں ہیں تو پڑھنے والے لاکھوں۔۔۔

ہمیں یہ جملہ پڑھے ہوئے کوئی تیس برس کی مدت تو گزر گئی ہوگی مگر اردو قارئین کی مجموعی صورتِ حال کے پیشِ نظر آج بھی اردو بلٹز کے اس جملے کی معنویت میں کوئی قابلِ ذکر تغیر نہیں آیا۔

لیکن یادگارِ سیماب شاعر 80 سال سے زائد عمر کو پہنچ رہا ہے تو اسی شہر اور اس کے نواح سے تکمیل، ترسیل، اِثبات، اردو چینل، تحریر نو، تریاق، صداقت، سیرت، ہدیٰ ٹائمز، بازدید، شناخت اور معیشت جیسے ماہنامے اور سہ ماہی ادبی جرائد جاری ہیں۔ آخر الذکر جریدوں (بازدید، شناخت اور معیشت) کا حال ہی میں اجرا ہوا ہے۔ جو اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں اردو کے جیالے موجود ہیں۔ آج صارفیت کا زمانہ ہے ایسے میں اسی چیز کی بقا نظر آ رہی ہے جو صارف کی طلب ہو، ۔۔۔ضرورتوں۔ اردو والوں پر دور تک نظر ڈالتے ہیں تو، ان کے یہاں اردو کے حوالے سے عملی زِندگی میں یہ طلب یا یہ ضرورت نظر بھی آتی ہے تو ترجیحات کی کئی منزلوں کے بعد۔

کوئی پچیس برس قبل یہ دو مصرعے کہے تھے جو اِس تحریر کا اختتامیہ بن رہے ہیں:

تھے قاری بہت اور خریدار کم
کہ جیسے میں، اردو کا اخبار تھا

❀❀❀

انجم عثمانی

اردو اور ٹیلی ویژن

برصغیر میں ٹیلی ویژن اپنے تاریخی ارتقا میں جو روایت ساتھ لے کر چلا وہ فلم اور ریڈیو کی روایت تھی جس میں طبعی اور تاریخی طور پر اردو کا عمل دخل شروع سے تھا اردو کی ہمہ گیری، گہرائی، اشاریت وبلاغت، شرینی وحسن اور سب سے بڑھ کر اس کی عوامیت ٹیلی ویژن کے خوب کام آئی، آج بھی آرہی ہے بلکہ اس کی ضرورت واہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات اس لیے نہیں کہی جارہی ہے کہ مادری زبان کی محبت کے چشمے سے ارتقا زیادہ اور زوال کم نظر آتا ہے بلکہ اس لیے کہی جارہی ہے کہ یہ ایک ناقابل تردید، خوش کن حقیقت ہے اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔

یہ تخصیص اور اختصار کا زمانہ ہے۔ فرصت کے لمحات اور ضروریات زیادہ ہیں اور اردو ایک ایسی جامع زبان ہے کہ اختصار اور تاثر پذیری اس کی ذاتی خصوصیات ہیں اور یہ تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے ہی رابطہ کی زبان ہے۔ اب ایک مثال دیکھیں: ٹیلی ویژن کی مقبولیت کی موجودہ دور میں اشتہارات کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اجتماعی ضروریات کی چیزوں سے لے کر انفرادی ضرورت کی معمولی سے معمولی چیز تک اشتہار کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے ٹی وی پر اشتہار دکھانے اور دکھانے کے لیے بنانے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ کبھی کبھی تو سکنڈوں میں دکھایا جانے والا اشتہار لمبے لمبے پروگراموں سے کہیں زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مواد کھپا دینا ضروری ہوتا ہے اور اس جامعیت واختصار کے لیے اردو موزوں ترین زبان ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی وقت ٹی وی پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو چند منٹ غور سے سن لیجیے، ممکن ہو تو ان میں بولے جانے والے الفاظ کو کاغذ پر لکھ لیجیے آپ پائیں گے کہ استعمال کی جانے والی زبان میں غالب عنصر اردو کا ہوگا لیکن ظاہر ہے کہ یہ روز مرہ کی بول چال کی زبان ہوگی، بولے جانے میں کیونکہ رسم الخط کا مسئلہ نہیں ہے اس لیے بات اور بھی آسان ہو جاتی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اشتہارات لکھنا ایک پروفیشنل معاملہ ہے اور کسی حد تک

تکنیکی بھی لیکن خیال کو لفظوں میں ڈھال سکنے والوں کے لیے یہ کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے، بس ذرا سی مشق اور معلومات سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر ٹی وی ایڈورٹائزنگ کی دنیا کو قریب سے دیکھیں تو اشتہارات لکھنے والوں کے لیے اردو زبان کا جاننا پیشہ ورانہ ضرورت ہے بھلے ہی کچھ مصلحتوں، تحفظات یا تعصبات کی وجہ سے وہ اس کو اردو زبان نہ کہتے ہوں۔

یہ ٹی وی میڈیم میں اردو زبان کی اہمیت کی صرف ایک مثال تھی ورنہ ذرا غور کیجیے کہ انگریزی اور علاقائی زبانوں کے علاوہ جتنے پروگرام بھی ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں انھیں چاہے کسی بھی وجہ سے عنوان کچھ بھی دیا جاتا ہو، ان سب میں اردو کا استعمال ناگزیر ہے اور جب سے سٹیلائٹ پرائیوٹ چینل شروع ہوئے ہیں تب سے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اردو کا جتنا فروغ ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ اردو کے ذریعے ٹیلی ویژن کا فروغ ہوا ہے۔

ٹی وی میڈیم میں اردو کے مسئلے کو اردو کتابوں کی اشاعت، اردو پڑھنے لکھنے والوں کی کمی وغیرہ جیسے مسائل سے ذرا مختلف طریقے پر دیکھنے کی ضرورت ہے جنھیں اردو زبان اپنی بنیادی خصوصیات اور رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے زیادہ بہتر طور پورا کرتی ہے، ویژول میڈیم اور اردو تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے فلموں نے ہمیشہ اس زبان کے ذریعے مقبولیت حاصل کی ہے۔ آج بھی اردو کے اثر سے کلیتاً مبرا ہو کر نہ فلم مقبول ہوتی ہے نہ ٹیلی ویژن کا کوئی پروگرام۔ بات زبان کی ہو رہی ہے تو اردو شعر و ادب اور ٹی وی کے حوالے سے بھی کچھ باتوں پر غور کر لیں۔

شعر و ادب کی مختلف اصناف سے بھی اس میڈیم میں بہت فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ غور کیجیے کون سا ایسا مقبول سیریل ہے جس میں اردو کے مکالموں (ادب) کا استعمال نہ کیا ہو۔ شاید ہی کوئی ایسا مقبول سیریل ہوگا جس کا ٹائٹل سونگ ۔ اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کا مرہون منت نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان اور شعر و ادب کا ڈکشن، سیریلز کے اسکرپٹ کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔

میں یہاں جان بوجھ کر ان پروگراموں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو روایتاً اردو کے پروگرام نہیں کہلاتے لیکن اس سرمایے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں بھلے ہی وہ اسے اردو کا نام نہ دیتے ہوں۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ویژول میڈیم کی تکنیکی ضرورتوں میں زبان کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ تصویر نے لفظ کی اہمیت اور ضرورت کو بہت کم کر دیا ہے۔ تکنیک کے حوالے سے عام طور پر یہ غلط فہمی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ غور کیجیے ٹی وی پروگراموں کے کچھ فارمیٹس سے قطع نظر کیا کوئی ایسا پروگرام ہوتا ہے جس میں لفظ استعمال نہ ہوتے ہیں۔ اس میڈیم میں استعمال ہونے والے تقریباً ہر

فارمیٹ میں بنے پروگرام کے پیچھے الفاظ ہی ہوتے ہیں اور یہ زبان ہی ہے جو تصویر کو زندہ رکھتی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ جب ٹی وی میڈم میں اردو زبان کا مسئلہ بولے جانے کی حد تک محدود تھا۔ یعنی تلفظ، لہجہ، رموز واوقاف وغیرہ۔ ٹی وی میڈیم میں رسم خط کا مسئلہ بہت محدود تھا اور اکثر مرحلوں پر تو تھا ہی نہیں کیونکہ ٹی وی کے پردے پر لکھے ہوئے الفاظ زیادہ سے زیادہ شرکا کے ناموں کے سپر کیپشنز اور پروگرام کے کریڈیٹس تک ہی محدود تھے۔ نہ اسکرول کی سہولت اور رواج تھا نہ ٹیکر وغیرہ کا کوئی تذکرہ تھا۔ مگر؛ فی زمانہ اخبارات ورسائل کی طرح ٹی وی اسکرین پر بھی لکھی جانے والی زبان کا مسئلہ زبان کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ ہے اس لیے کہ اب ٹی وی پر زبان صرف بولی ہی نہیں لکھی بھی جاتی ہے بلکہ جب تک اسکرین روشن رہتا ہے مختلف طریقوں سے کچھ نہ کچھ لکھے رہنا نشریات کی ضرورت میں شامل ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب ٹی وی پروگرامز میں وہ مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں جو لکھے ہوئے لفظ سے متعلق ہیں یونی املا، ہجے اور زبان کا طرز نگارش یعنی ڈکشن۔

افسوس اس بات کا ہے کہ وہ ساری خرابیاں ترسیل کے دوسرے ذرائع مثلاً اخبارات ورسائل وغیرہ میں بکثرت سرایت کر چکی ہیں، ٹی وی کے پردے پر مزید سنگین صورت حال کے ساتھ موجود ہیں اور زبان کی غلطیوں بلکہ غلط زبان کے ذریعے جتنا نقصان دوسرے ذرائع پہنچا رہا ہے ٹی وی اپنی پہنچ کی وسعت کے اعتبار سے اسے دور دور تک پہنچا رہا ہے۔

اردو زبان کے حوالے سے الکٹرانک میڈیم اور پرنٹ میڈیا میں فی الوقت سب سے سنگین مسئلہ زبان کے ڈکشن کا ہے۔ افسوس کے ساتھ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ گذشتہ چند برس میں ہی اتنی بڑی خرابی، اتنی تیزی کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر کیسے عام ہو گئی کہ اردو میں ترسیل وابلاغ کے بیشتر ذرائع اس کی زد میں آ گئے۔ ڈکشن کی خرابی کا جرثومہ کہاں سے پیدا ہوا اور کیوں اس قدر پھیل کر حاوی ہو گیا ہے۔

زبان کے ڈکشن کا معاملہ الفاظ کے استعمال کے علاقائی فرق، املا کے معمولی اختلافات، تذکیر وتانیث، واحد وجمع کے تفاوت سے کہیں زیادہ سنگین ہے اس لیے کہ زبان کا ڈکشن بدل جانے سے پورا ڈھانچہ ہی بدل جاتا ہے۔ اس طرح کی تبدیلی بلکہ خرابی کو وقت کے ساتھ زبان میں فطری تبدیلی کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہر زبان میں وقت کے ساتھ کچھ نئے لفظ داخل ہوتے اور کچھ پرانے متروک ہوتے رہتے ہیں یہ ایک فطری عمل ہے جس سے سب زبانیں گذرتی اور ترقی پاتی ہیں مگر الفاظ کے داخل خارج سے زبان کا ڈکشن نہیں بدلا کرتا اس لیے کہ اگر لفظ زبان کا جسم اور معانی ومطالب اس کی روح ہیں تو ڈکشن زبان کے جسم کی وہ ترتیب وتجسیم جس سے زبان

کے اعضا ترتیب پا کر زبان کا بنیادی ڈھانچہ بنتے ہیں۔ جسم کے لیے موسم۔ ضرورت، آرائش، رسم و رواج وغیرہ وغیرہ کے لیے لباس تو بدلے جا سکتے ہیں اور بدلے جاتے ہیں مگر جسم میں ناک کی جگہ آنکھ، آنکھ کی جگہ ٹانگ، ٹانگ کی جگہ ہاتھ نہیں لگائے جاتے۔ آج کل الکٹرانک پرنٹ میڈیا میں اردو زبان کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ یہ نہ صرف خطرناک ترین صورت حال ہے بلکہ ہم اردو والوں کی اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ خیانت اور ناانصافی بھی ہے۔ ہمارے بزرگ ترین صحافیوں نے (جن میں آج کے سیمینار کے ہیرو چندن صاحب بھی شامل ہیں) اپنی زندگیاں ترسیل کے ذرائع میں اس لیے صرف نہیں کی تھیں کہ ہم اس خوبصورت، مقبول اور موثر زبان کے ڈکشن کو قطع و برید کر کے ایسا بنا دیں کہ اس کی شناخت ہی ختم ہو جائے۔

اب رہی بات تکنیک کی ترقی زمانہ تکنیکی افراد کے لیے عام طور پر اور ہدایت کار، کیمرہ مین، اڈیٹر اور گرافکس ڈیزائنر کے لیے خاص طور پر اردو زبان کا جاننا بے حد مفید ہے بلکہ بہت سے کام ایسے ہیں جو زبان جانے بغیر تکنیکی طور پر بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر اڈیٹر کو یہ خبر نہ ہو کہ مصرع کہاں ختم ہوا تو وہ اس منظر کو خود ایڈٹ نہیں کر سکتا، اگر کیمرہ پرسن کو زبان نہ آتی ہو تو وہ اس زبان کی تہذیب سے مطابقت رکھتے ہوئے زاویوں کا استعمال نہ کر پائے گا۔ کیونکہ ٹی وی میڈیم میں بیشتر تکنیکی کام تخلیقی اور تخیلی قوتوں سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کو صرف مشین آپریٹر نہیں کہا جا سکتا بلکہ مشین کا تخلیقی استعمال ہی تکنیکی لوگوں کو ممتاز، ماہر اور مکمل بناتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ٹی وی میڈیم کی ہر صنف نے اردو زبان و ادب اور شعری سرمایے کا استعمال کیا ہے۔ کر رہے ہیں اور جب تک اس کے ذریعے سرمایہ اکٹھا کیا جا سکے گا یہ اس کا استعمال اور جہاں جہاں موقع ملے گا استحصال کرتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ جب ٹی وی کی مقبولیت اردو کے کاندھوں پر چڑھ کر مسلسل اپنا قد بڑھا رہی ہے اور اس کا اثر و نفوذ درد خانہ تک سرایت کر گیا ہے تو اسی کی اثر پذیری کا ایک ایک مضبوط سبب اردو زبان کا اثر نفوذ اتنا کیوں نہیں ہے، یہ ٹیلی ویژن گھر کے اندر اور گھر کے باہر، بے خانماں کیوں ہے اسی سوال کا جواب بڑی حد تک اس سیاسی اور صارفیاتی نظام میں پوشیدہ ہے جو زبان ہے یا تہذیب، شخصی ہو یا سماج ہر شے کو صرف مادی فائدوں بلکہ سطحی مادی فائدوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہندوستان میں ٹیلی ویژن کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جب یہ میڈیم مقبول ہو گیا (اور اس کی مقبولیت میں جیسا کہ عرض کیا گیا اردو زبان کا بڑا حصہ ہے) تو اس پر تاجروں

نے قبضہ جمالیا جن کا مقصد ہر طریقے سے اپنی مصنوعات کو بیچنا اور دولت کمانا ہے۔ جن کی اخلاقیات، جن کے ایمان، جن کی وفاداریاں صرف اور صرف تجوری کے ساتھ ہیں۔ معاملہ مقاصد اور نیت کا ہے صاف ہے اپنے پروڈکٹس بیچنے کے لیے انھیں اردو کی ضرورت ہے۔ بیچنے کے لیے انھیں صابن کو صابن کہنا پڑتا ہے۔ تیل کو تیل۔ اس لیے وہ لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ زبان، زبان سے وابستہ تہذیب اور اخلاقیات ان کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ اس لیے صابون تو خوب بکتے ہیں مگر نہانے کی تمیز اور املا نہیں آتا۔ جبکہ کوئی بھی عوامی ذریعہ ابلاغ ہو اس کا استعمال عوام تک ارفع خیالات پہنچانے، تطہیر نفس، صحت مند تفریح اور صحیح معلومات کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ ایجادات رحمت ہیں لیکن تاجرانہ ذہنیت نے ان ایجادات کو عیاشی اور زحمت بنادیا ہے اور اس کے لیے وہ ہر اس ذریعے کو استعمال کرتے ہیں جو فوری طور پر عوام سے رابطہ قائم کرا کے اثر انداز ہوسکے بھلے ہی وہ اردو جیسی پاکیزہ زبان ہی کیوں نہ ہو۔

صاف ظاہر ہے کہ ہندستان میں ٹیلی ویژن نے اردو زبان سے بہت کچھ لیا ہے، اس کے ادب اس کی شاعری اس کے ڈکشن اور اس کی عوامی رابطیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے مگر یہی میڈیم اس زبان اور اس سے وابستہ تہذیب اور اس سے متعلق افراد سے لاتعلق ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آپ آم کھائیے پیڑ نہ گنیے، اردو کا استعمال ہو رہا ہے اور بہت ہو رہا ہے پھر شکایت کس بات کی۔ مگر ''آم کھانا اور پیڑ نہ گننا'' والی بات پر عمل کرتے کرتے ہم نے اپنے باغ ہی گنوادیے ہیں نتیجہ یہ کہ ادھر تو یہ عالم کہ اردو کے جسم کے ہر مہر قطرے سے صابون اور تیل بنا بنا کر دولت کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور ادھر یہ حالت کہ ہم اردو والوں نے اس میڈیم میں پیشہ ورانہ طور پر جگہ بنانے کے لیے سنجیدگی سے سوچنا بھی شروع نہیں کیا ہے۔ اب پتہ نہیں کہ فضا ہی زخمی ہے یا آنکھوں میں زخم آگئے ہیں کہ منظر تڑپتے دکھائی دیتے ہیں۔

آج کا یہ سیمینار اگر حالات کا تجزیہ کر کے ہم لوگوں کو مثبت عمل پر آمادگی کی طرف ایک آدھ قدم بھی لے جائے تو یہ بڑا کام ہوگا ورنہ مضامین لکھنا، سنانا اور ہر مذاکرہ کے بعد اگلے مذاکرے تک مراقبے میں رہنا ہے تو پھر کسی سے کیا شکوہ۔ آخر میں میر جی کی زبان میں:

افسردگی سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

❁❁❁

سہیل انجم

اردو صحافت کی معدوم ہوتی صنف فیچر نگاری

ہندوستانی زبانوں میں بالخصوص اردو صحافت میں فیچر رائٹنگ کا بہت فقدان ہے۔ جبکہ امریکہ اور مغربی ملکوں کی صحافت میں اس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اخباروں کے ضمیموں میں ان کو نمایاں انداز میں شائع کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں فیچر ایجنسیاں ہوتی ہیں جو اخباروں کو مختلف موضوعات پر فیچر آئٹم فراہم کرتی ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی صحافت میں فیچر رائٹنگ کے لیے بہت گنجائش ہے بلکہ بہتات ہے۔ ہفتے اور اتوار کے ایڈیشنوں میں انہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن اردو کے وہ اخبار جو ہفتے میں ایک روز ضمیمہ شائع کرتے ہیں وہ بھی فیچر کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں چونکہ انگریزی دور حکومت کے خلاف بغاوت کے عوامی رجحانات کے پس منظر میں اردو روزنامہ اخباروں کا جنم ہوا ہے اس لیے ان میں سنجیدہ مضامین کی بہتات ہوتی ہے ہلکے پھلکے مضامین کم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ قرین حقیقت نہیں ہے۔ ثبوت کے طور پاکستان کی اردو صحافت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں کلکتہ شہر کو ''مادر صحافت'' ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہیں سے پہلے انگریزی پھر فارسی، اس کے بعد اردو اور پھر ہندی زبانوں کے اخبارات جاری ہوئے ہیں اور کلکتہ شہر ہندوستان میں ہے، پاکستان میں نہیں۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں اردو اخباروں میں فیچر اسٹوریز شائع ہوتی ہیں اور ہندوستان اس معاملے میں اس سے پیچھے ہے۔ جب دہلی سے روزنامہ قومی آواز شائع ہوتا تھا تو اس میں فیچر اسٹوری کی جاتی تھی۔ روزنامہ اخبار میں بھی، ہفت روزہ قومی آواز میں بھی اور بعد میں ضمیمہ میں بھی۔ حالانکہ آخری دنوں میں اس میں بھی یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا۔

غیر افسانوی نثری اصناف میں فیچر نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اگر فیچر نویس اپنی وسعت مشاہدہ، تخیل آفرینی اور لطافت و شگفتگی سے کام لیتے ہوئے کوئی اچھا فیچر تحریر کرتا ہے تو وہ

نہ صرف یہ کہ اعلیٰ نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہوسکتا ہے بلکہ اسے ادبی شہہ پارے کی حیثیت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ فیچر نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن اگر کسی صحافی یا قلم کار کو اس میں مہارت ہو جائے تو اس کے تحریر کردہ فیچر تو مقبول ہوں گے ہی فیچر نویس کی شہرت بھی بڑھ جائے گی۔ فیچر اور مضمون میں بہت فرق ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ جو شخص اچھا مدیر، اچھا مضمون نگار اور اچھا صحافی ہو وہ اچھا فیچر نویس بھی ہو۔ کیونکہ ثانی الذکر میں کچھ نکتوں اور باریکیوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر ان کو نظر انداز کر دیا گیا تو عمدہ فیچر نگاری نہیں ہو سکے گی۔ کوئی بھی مضمون جہاں سنجیدگی کا متقاضی ہوتا ہے وہیں فیچر کے لیے دلچسپ اور پُر لطف پیرایہ بیان ضروری ہے۔ مضمون کی عمارت جہاں ٹھوس حقائق کی بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے وہیں فیچر کی تعمیر مشاہدے اور وجدان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ مضمون جہاں معلوماتی ادب کا نمائندہ ہوتا ہے وہیں فیچر تفریحی ادب کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ تفریحی ادب بھی اردو زبان وادب کے خزانے کا ایک گراں قدر حصہ ہے، اس لیے فیچر کو تفریحی ادب کہہ کر نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت کم کی جا سکتی ہے۔

یہاں میں پاکستان سے شائع ہونے والے سب سے بڑے اخبار روزنامہ جنگ کے ہفتہ وار ایڈیشن ''سنڈے میگزین'' کا ایک حوالہ دینا چاہوں گا۔ نئے سال کی آمد پر اس میں خواتین کی پسند اور ان کے ذوق وشوق پر ایک فیچر شائع ہوا ہے جس کا ابتدائیہ ملاحظہ فرمائیں ''شاعر نے کیا خوب کہا ہے ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''۔ خواتین ہر معاملے میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں، کبھی انھیں گھر سجانے کی فکر لاحق ہوتی ہے، کبھی فرنیچر کو جدید رنگ دینے کا خیال آتا ہے، کبھیں کچن کے لیے نئے اسٹائل کے برتنوں کے بھاؤ تاؤ کرتی نظر آتی ہیں تو کہیں میڈیا کی چکا چوند سے متاثر ہوکر کچھ نیا کر گزرنے کا خیال دل میں دستک دیتا رہتا ہے اور اگر ورکنگ ویمن ہیں تو کولیگز کے ساتھ مسابقت میں آگے بڑھ جانے کے خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے کوشاں رہتی ہیں''۔

فیچر نگاری کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ شرط صرف دیدہ بینا کی ہے۔ جہاں بڑے معاملات کو فیچر کا موضوع بنایا جا سکتا ہے وہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آجکل پزا، برگر اور موموز کھانے کا چلن ہے۔ آپ کسی مال میں چلے جائیں آپ کو ان کے شوقین بڑی تعداد میں مل جائیں گے۔ آپ ان سے بات کرکے، اسٹالوں کے مالکوں سے

بات کر کے یا پھر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر موموز بیچنے اور خریدنے والوں سے گفتگو کر کے فیچر تیار کر سکتے ہیں۔ یا پھر ایک مستقل عنوان کے تحت بھی فیچر نگاری کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سماج کے گرے پڑے، دبے کچلے اور محروم طبقات کے مسائل کو بھی موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک مستقل فیچر کا عنوان رکھا جا سکتا ہے "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں" اور پھر کسی ہفتے رکشے والوں کو پکڑ لیا، کسی ہفتے ریڑھی والوں کو پکڑ لیا، کسی ہفتے مساجد کے ائمہ اور موذنوں کو اپنا موضوع بنا لیا، کسی شمارے میں دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے بات کر لی، ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کی اور ایک فیچر تیار کر دیا۔ کسی ہفتے سڑکوں پر اور گلیوں میں جھاڑو لگانے والوں سے رابطہ قائم کر لیا، کسی شمارے میں اخبار کے ہاکروں کے مسائل معلوم کر لیے، کبھی شادیوں میں ٹینٹ لگانے والوں کو جا لیا اور کھانے سے پہلے مہمانوں کی ضیافت میں سرگرم ویٹروں سے بات کر لی۔ گویا فیچر لکھنے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے، ضرورت ان کو تلاش کرنے کی ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کا مشاہدہ وسیع ہو، جو دقتِ نظر سے کام لینا جانتا ہو اور جسے شستہ، شگفتہ، سلیس اور پُر لطف زبان لکھنے کی مہارت ہو۔ اس کے لیے کشادہ وژن کی ضرورت ہے، دور بیں نگاہ کی ضرورت ہے اور کسی بھی معمولی شے میں پنہاں غیر معمولی خصوصیات کا ادراک کر لینے والی حس کی ضرورت ہے۔

اس کے علاوہ روایتی موضوعات بھی موجود ہیں جن پر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ نیوز فیچر، ادبی فیچر، تاریخی، ثقافتی، شخصیاتی، سائنسی، سیاحتی وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ دور میڈیا کا دور ہے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے ان چیزوں کو بھی بے نقاب کر دیا ہے جو پہلے پردے میں پنہاں رہتی تھیں۔ آج معمولی سا شخص بھی اپنے اندر خبر بننے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ آج چھوٹی اور معمولی باتیں بھی بڑی اور غیر معمولی بن گئی ہیں۔ موضوعات کی بہتات ہے اور دنیاوی رنگارنگی نے ان میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ آج آپ شام کے وقت انڈیا گیٹ چلے جائیں وہاں مختلف اقسام کے افراد مل جائیں گے۔ اگر وہاں ایک دو گھنٹے لگا دیے جائیں تو فیچر نگاری کے متعدد موضوعات اور مواد کی فراہمی ہو جائے گی۔ یا پھر کچھ ایسے موضوعات تلاش کیے جائیں جن کا تعلق پرانی اور نئی دونوں نسلوں سے ہو۔ جیسے کہ خطوط نویسی۔ پہلے خطوط کے ذریعے ہی رابطے قائم ہوتے تھے مگر موبائل اور انٹرنیٹ نے اس روایت کو بے حد کمزور کر دیا ہے۔ آپ کسی پرانے شخص سے اس بارے میں بات

کر سکتے ہیں اور ان کے زمانے کے خطوط سے متعلق ذاتی واقعات معلوم کر کے فیچر لکھ سکتے ہیں۔

پہلے ریڈیو کے لیے کافی فیچر لکھے جاتے تھے لیکن اب وہاں بھی یہ سلسلہ کم سا ہو گیا ہے۔ البتہ ٹی وی پر کچھ اسی قسم کے پروگرام کبھی کبھار نظر آ جاتے ہیں۔ اشوک چکردھر ایسا ہی ایک ہفتہ واری پروگرام ڈی ڈی بھارتی پر پیش کرتے ہیں جس کا نام ہے ''چلے آؤ چکردھر چمن میں''۔ کسی ایک اچھوتے موضوع پر ایک گھنٹے کے اس دلچسپ پروگرام میں بہت سی کارآمد باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔ ابھی گذشتہ دنوں انھوں نے ''مونچھوں'' پر ایک پروگرام پیش کیا تھا جو بہت ہی دلچسپ اور لاجواب تھا۔ ''خطوط نویسی'' پر بھی وہ ایک گھنٹے کا پروگرام پیش کر چکے ہیں۔ اس پروگرام میں ذرا بھی بوریت نہیں ہوتی۔ اسے ٹی وی فیچر کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

فیچر نگاری کے اصول

فیچر نگاری کے کچھ اصول ہیں جن کو اگر برتا نہیں گیا تو فیچر مضمون تو بن سکتا ہے، فیچر نہیں۔ اس کے لیے قوت مشاہدہ ہونی چاہیے، گہری اور تیز نظر ہونی چاہیے۔ ایسی گہری نظر، ایسی دوررس نگاہ کہ جو بادی النظری کے پردے کو چاک کر کے کسی بھی شے کے اندر چھپی ہوئی خصوصیات کو بے نقاب کر دے۔ جب قوت مشاہدہ اپنا کام کرتی ہے تو وہ مناظر بھی بے پردہ ہو جاتے ہیں جن تک عام نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔ قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ وجدان کی بھی بے حد ضرورت ہے۔ وجدان سے خالی اذہان فیچر نگاری کے معیار پر کھرے نہیں اتر سکتے۔ وجدان کو عملی شکل دینے کے لیے قلم میں بھی جان ہونی چاہیے۔ جب تک وجدان اور قلم کی جان باہم شیر و شکر نہیں ہوں گے قوت مشاہدہ سے کام لینا مشکل ہو جائے گا۔ فیچر نویسی کے لیے اختصار اور لطافت و شگفتگی کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔ اسے نہ تو مضمون کی مانند طویل ہونا چاہیے اور نہ ہی سنجیدہ، بے کیف اور بے لطف ہونا چاہیے۔ کم سے کم اور دلچسپ الفاظ میں اپنی بات کہنی چاہیے اور دلکش انداز بیان اختیار کرنا چاہیے۔ بھاری بھرکم اور مہتم بالشان الفاظ سے گریز اور شستہ و شگفتہ زبان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ کسی خبر میں جہاں انٹرو ہی میں اختصار کے ساتھ اصل واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے اور پھر زینہ بہ زینہ اس کی توضیح کی جاتی ہے وہیں فیچر کے انٹرو میں اصل واقعہ بیان نہیں کیا جاتا۔ انٹرو یا پہلے پیراگراف میں ایسی ندرت بیان ہونی چاہیے کہ وہ قاری کو فوری طور اپنی گرفت میں لے لے اور وہ پوری تحریر پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ خبر جہاں ''کرنٹ نیوز'' پر مبنی ہوتی ہے وہیں فیچر میں کسی شخصیت، کسی مقام

یا کسی مسئلے کے ایک ہی پہلو کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے یا ایک ہی نقطہ نظر کو اجاگر کیا جاتا ہے۔
کسی مخصوص مضمون کے لیے وسعت مطالعہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حقائق چھان پھٹک کر پیش کیے جاتے ہیں۔ منظر، پس منظر اور پیش منظر کی صحت اور عمدگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور صحیح اعداد و شمار پر توجہ دی جاتی ہے۔ جبکہ فیچر میں آنکھوں اور کانوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اسے ہلکا پھلکا ہونا چاہئے اور تحریر میں طرز نو کی بنیاد ڈالنی چاہئے۔ مضمون نگاری کے لیے ''آمد'' کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی لیکن فیچر میں آمد کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اختصار فیچر کی روح اور طوالت اس کے لیے زہر ہے۔ کبھی کبھی مضمون اکتا دینے والا ہوتا ہے، طبیعت گراں بار ہو جاتی ہے اور بوریت ہونے لگتی ہے لیکن فیچر کو ان عیوب سے پاک ہونا چاہئے۔ اس میں نہ تو دلائل کی ضرورت ہے نہ فلسفے کی، نہ عالمانہ فضیلت کی اور نہ ہی دقیق نکتہ سنجیوں کی۔ یہ ایک زندہ دلانہ فن ہے اور اس کو تحریر کرتے وقت یہ بات بہرصورت ذہن میں رہنی چاہئے۔ اس میں الفاظ کے انتخاب کی بھی اہمیت ہے۔ مترادفات استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن وہ اتنے زیادہ بھی نہ ہوں کہ بوریت پیدا کر دیں۔ جملے پُر لطف ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس بھی ہونے چاہئیں اور تحریر میں عقدہ کشائی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس میں کسی کے قول یا کوٹیشن کا بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہ قول یا کوٹیشن بھاری بھرکم ہونے کی بجائے ہلکا پھلکا ہونا چاہئے۔

فیچر کا پہلا پیراگراف جسے انٹرو کہتے ہیں ''خبریت'' سے بوجھل نہیں ہونا چاہئے بلکہ شستگی و شگفتگی کے ساتھ بات شروع کی جانی چاہئے۔ لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ فیچر کسی اور موضوع پر ہو اور انٹرو کسی اور سمت میں جا رہا ہو۔ دلچسپ پیرایہ بیان کیسے اختیار کیا جائے، میں اس کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی گذشتہ دنوں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ اور ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام سپریم کورٹ کے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے ''اردو کیا ہے؟'' کے عنوان سے جامعہ ملیہ میں ایک خطبہ پیش کیا تھا۔ خطبے کے اختتام پر ایک روزنامہ اخبار کے مدیر نے راقم الحروف سے کہا کہ انھیں اس کی رپورٹ چاہئے اور وہ تمھیں ہی لکھنی ہے۔ راقم نے اس خبر کا آغاز موضوع اور خطیب کی انفرادیت کے پیش نظر قدرے دلچسپ انداز میں کیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ''سپریم کورٹ کے آنریبل جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خیابان اجمل میں اردو عدالت

لگائی۔ لیکن انھوں نے فیصلہ نہیں سنایا بلکہ اردو کی وکالت کی اور اردو زبان کے ایک شیدائی کی حیثیت سے اس کا مقدمہ لڑا اور اردو کے ایک وکیل کی حیثیت سے مدلل، پُر اثر اور قائل کن بحث اور جرح کی۔ انھوں نے اس باوقار تقریب میں موجود متعدد معزز ججوں اور وکلا حضرات سے درخواست کی کہ وہ بھی ان کی مانند اردو زبان کا کیس لڑنے کے لیے آگے آئیں اور جج حضرات اپنے فیصلوں میں اور وکلا اپنی بحثوں میں اردو زبان اور اردو اشعار کا خوب استعمال کریں''۔ اس اقتباس یا خبر کے پہلے پیراگراف میں عدالت، جج، وکیل، مقدمہ، بحث اور جرح جیسے الفاظ کو ایک خاص تناظر میں اور ان کی پوری معنویت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جس سے خبر کے پہلے پیراگراف میں انفرادیت آگئی، شستگی اور شگفتگی بھی آگئی اور دلچسپ پیرایہ بیان بھی پیدا ہو گیا۔ اس خبر کو سیدھے سادے اور سپاٹ انداز میں بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن اس صورت میں مذکورہ الفاظ کی معنویت اجاگر نہیں ہو پاتی اور نہ ہی وجدان اور مشاہدے کا استعمال ہو پاتا۔

فیچر رائٹنگ میں اگر ان نکات کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو اچھی فیچر اسٹوری تیار ہو سکتی ہے: ابتدائیہ اور اختتامیہ تو مضمون میں بھی ضروری ہوتے ہیں اور فیچر اسٹوری میں بھی۔ لیکن فیچر اسٹوری میں مزید دو پہلوؤں پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ یہ ہیں: تبدیلی فارم اور کوٹیشن۔ ابتدائیہ کو لیڈ یا انٹرو کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اپنے دلچسپ انداز بیان سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لینا اور اسے پوری تحریر پڑھنے کے لیے مجبور کر دینا ہے۔ اس حصے میں منظر نگاری کرتے وقت اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اسے مختصر تو ہونا ہی چاہیے لیکن موضوع کا تعارف بھی ہو جانا چاہیے۔ البتہ یہ تعارف ایک دو جملوں سے زیادہ نہ ہو۔ اس حصے میں اگر ہو سکے تو سسپنس پیدا کیا جائے، کچھ انفارمیشن ہو لیکن بیشتر انفارمیشن تحریر کے اگلے حصوں کے لیے چھوڑ دی جائے۔ دوسرا مرحلہ ٹرانزیشن کا یعنی تبدیلی فارم کا ہے۔ جس طرح قصیدہ میں گریز ہوتا ہے تقریباً اسی طرح ٹرانزیشن کا مرحلہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں رائٹنگ فارم میں تبدیلی لانی ہوتی ہے اور آگے بڑھنے کے لیے قاری کی حوصلہ افزائی کرنی ہوتی ہے۔ اس کے لیے ریسرچ، انٹرویو، رائے شماری یا سروے کے نتائج کو اس انداز میں بیان کرنا ہوتا ہے کہ قاری بور بھی نہ ہو اور کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے۔ تیسرا مرحلہ کوٹیشن کا ہے۔ اس کا مقصد بھی قاری کو باندھنا ہوتا ہے۔ اگر کسی فیچر رائٹنگ کے لیے کسی کا انٹرویو کیا گیا ہے تو قلم کار کو چاہیے کہ وہ انٹرویو کے دوران سامنے والے کو

بولنے کا زیادہ موقع دے اور پورے انٹرویو میں اسے وقت کے صرف بیس فیصد حصے ہی میں بولنا چاہئے۔ انٹرویو کی روشنی میں سامنے آئی باتوں کو بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا جانا ضروری ہے۔اس میں بھی جملوں کو بہت ہی مختصر لکھا جانا چاہئے۔مثال کے طور پر اگر یہ بات کہنی ہے کہ ''فلاں ٹیم کے ذریعے فلاں ریکارڈ کو توڑ دیا گیا'' تو اختصار کا تقاضہ ہے کہ اسے یوں لکھا جائے ''فلاں ٹیم نے فلاں ریکارڈ توڑ دیا''۔اس طرح الفاظ کو بچایا جا سکتا ہے۔یعنی جملے کو مختصر بنایا جا سکتا ہے۔اختتامیہ بھی ابتدائیہ کی مانند موثر اور پر کشش ہونا چاہئے۔آخری چند جملوں میں قاری پر ایک مضبوط تاثر پیدا ہونا چاہئے۔اس کے لیے کسی ایک جملے میں اپنے موضوع کو مربوط کر کے پیش کرنا ہوتا ہے یا پھر ابتدائیہ کے کسی جملے کا اعادہ خوبصورت انداز میں کرنا ہوتا ہے۔

بہر حال فیچر نویسی کو غیر افسانوی نثری صنف میں یا صحافت میں ایک اہم مقام حاصل۔سید اقبال قادری کے مطابق ''فیچر کا صحافت میں وہی مقام ہے جو اردو شاعری میں غزل کا ہے۔جس طرح نظم، قصیدہ، مرثیہ اور مسدس کے مقابلے میں غزل اردو دانوں کو زیادہ پسند آتی ہے بالکل اسی طرح صحافت میں فیچر کا ایک امتیازی درجہ ہے۔جس طرح غزل کے اشعار میں رنگینی، شستگی، شوخی اور شگفتگی ہوتی ہے فیچر میں بھی ایسی ندرت ضروری ہے۔مضمون کئی کمروں والی ہمہ منزلہ حویلی ہے تو فیچر ایک پاک صاف، خوبصورت اور آرام دہ چھوٹا سا مکان ہے''۔مگر جس طرح اچھی غزل سننی آسان اور کہنی مشکل ہے اسی طرح اچھا فیچر پڑھنا آسان اور لکھنا مشکل ہے۔اس کے لیے وسعت مطالعہ، تخیل آفرینی، ندرت فکر، شستہ شگفتہ اور شیریں زبان لکھنے کی صلاحیت اور وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کے بغیر اچھا صحافی اور اچھا مضمون نگار تو بنا جا سکتا ہے، اچھا فیچر نگار نہیں۔افسوس کا مقام ہے کہ آج یہ صنف اردو صحافت سے معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ فیچر رائٹنگ کا احیا کیا جائے اور اردو میں فیچر نویس تلاش کیے جائیں تا کہ اردو صحافت اپنی ایک متاع گم گشتہ کی از سر نو بازیافت کر سکے۔

❁❁❁

فرحت رضوی

اردو صحافت کے سفر میں خواتین کا پہلا قدم

اردو صحافت کے ارتقاء پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جانے کی گنجائش ہے۔ خاص طور سے اردو صحافت کے ارتقاء کی حصہ داری کے موضوع پر۔ اردو صحافت سے متعلق جب بھی کوئی کتاب یا خواتین نمبر ہاتھ لگا تو پڑھکر مایوسی ہی ہوئی کیونکہ خواتین صحافیوں، خواتین کے لئے نکالے گئے رسالے اور خواتین کی ادارت میں نکلنے والے رسالوں کے بارے میں تذکرہ کرنا محققین نے ضروری نہیں سمجھا۔ شاید اس بے توجہی کی ایک بڑی وجہ یہ رہی ہو کہ شروعاتی کئی دہائیوں تک خواتین کی صحافت ماہناموں۔ پندرہ روزہ یا ہفت روزہ رسائل تک محدود رہی۔ روزناموں سے ان کی وابستگی بہت بعد میں ہوئی۔ لیکن صحافت سے متعلق کتابوں میں جہاں اردو کے رسائل کا ذکر ہے وہاں بھی خواتین کے رسالوں کے ذکر سے گریز کیا ہے۔ کئی برس پہلے جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قومی کمیشن برائے خواتین کے اشتراک سے اقلیتی طبقے کی خواتین کی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کارناموں پر ایک نیشنل سیمنار کا انعقاد ہوا تو اردو صحافت میں خواتین کے رول خاص طور سے شروعاتی دور کے رسائل اور صحافی خواتین کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں مل سکیں۔ البتہ اردو میں خواتین کی ناول نگاری پر جن چند خواتین نے تحقیقی کام کیا ہے، جو کتابی شکل میں بھی آ چکا ہے اس سے کچھ مدد ملی، جیسے بہار سے ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل کی تحقیق (۱۹۹۱) پر مبنی کتاب مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں اردو ناولوں کا حصہ اور ڈاکٹر نیلم فرزانہ کی کتاب اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار (۱۹۹۲) اس کے علاوہ انگریزی کی کتاب جسے اے ایم یو کی ڈاکٹر ذکیہ صدیقی اور ڈاکٹر انور جہاں زبیری نے ایڈٹ کیا ہے، اے ایم یو کے پی آر او ڈاکٹر راحت ابرار کے تحقیقی مقالے پر مبنی کتاب مسلم تعلیمی نسواں کے سو سال۔ چلمن سے چاند تک (۲۰۱۱) سے بھی کچھ حوالے ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین کی تصنیف اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے تو ابھی

دو سال پہلے ۲۰۱۴ میں قارئین کے ہاتھ میں آئی ہے۔ تین سال قبل حیدرآباد میں خواتین کی صحافت پر سہ روزہ ایک ورکشاپ میں شرکت کا موقع ملا تو وہاں پڑھے گئے مقالوں سے بہت استفادہ ہوا۔ وہیں پر ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اپنا تحقیقی مقالہ حیدرآباد کے ادبی رسائل۔ آزادی کے بعد حال تک (۲۰۱۰) نے اس موضوع پر میری راہ مزید آسان کردی۔ ڈاکٹر ناظم نے تقریباً خواتین کے رسائل کا ذکر کیا ہے جو حیدرآباد سے جاری ہوئے۔ یہ مقالہ بھی کتابی شکل میں آچکا ہے۔ مختلف صحافیوں اور ادیبوں کے مضامین پر مبنی دو کتابیں پہلی انور علی دہلوی کی مرتب اردو صحافت اور دوسری خالد محمود و سرورالہدیٰ کی ترتیب دی ہوئی اردو صحافت ماضی اور حال قابل ذکر ہیں۔ خاص طور سے مدھیہ پردیش، بہار، پنجاب، اتر پردیش اور دہلی کی صحافت پر جو مضامین ہیں ان میں ممتاز مرزا اور نور جہاں ثروت کے مضمون اس طرف روشنی ڈالتے ہیں۔

مدھیہ پردیش کے سینئر صحافی اشتیاق عارف کی تصنیف یادوں کی بازیافت اگرچہ طویل صحافتی خدمات کے دوران ان کے ذاتی تجربات کی کہانی ہے لیکن بھوپال سے شائع ہونے والے الحجاب اور ظل السبحان جیسے زنانے رسالوں کے علاوہ انہوں نے ایک اور رسالے افشاں کا ذکر کیا ہے جو ان کی ادارت میں خواتین کے لئے بھوپال سے جاری کیا گیا تھا لیکن دو چار اشاعتوں کے بعد بند ہوگیا تھا۔ اس کتاب میں خالدہ بلگرامی کے روزنامہ آفتاب جدید میں تقرر کا بھی تذکرہ ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی اخبار کے دفتر میں وہ بھی روزنامہ میں کسی خاتون کا کام کرنا شہر ممنوعہ میں قدم رکھنے کے برابر ہے۔

اردو میں خواتین کے شروعاتی رسائل اور ان کے ذریعہ عورتوں میں بیداری کس طرح پیدا کی اس ضمن میں دیونا گری میں شائع کلامِ نسواں کا ذکر اور سماجی فلاح کے لئے کام کر رہے نرنتر ادارے کی خدمات کا اعتراف بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر اردو والوں کے بجائے ہندی میں ایک مثبت پہل ہوئی ہے۔ نرنتر جو تعلیم نسواں کے ذریعہ خواتین کو بااختیار بنانے کے لئے مسلسل کوشاں ہے اردو میں خواتین کے کچھ اولین رسالوں کے مضامین پر مبنی خصوصی ضمیمہ کلامِ نسواں کی اشاعت کی۔ یہ تحقیقی کام ہما خان نے اپوروا بھاردواج کی ادارت میں کیا ہے۔ بلکہ اپوروا بھاردواج اور ان کی ٹیم نے مارچ ۲۰۱۶ میں یومِ خواتین کے موقع پر اردو خواتین قلمکاروں کی تخلیق پر ایک مکالماتی اسٹیج شو بھی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں پیش کیا تھا۔ اس پروگرام کے لئے انہوں نے تہذیب نسواں، خاتون، اُستانی، پیامِ امید اور عصمت جیسے اولین رسالوں سے عورتوں

کی تعلیم اور سوسائٹی میں ان کی حیثیت، انگلستان میں بیداریٔ نسواں کی جدوجہد، تحریک نسواں اور ہندوستان کی ریاستیں، خواتین کے لکھے گئے خطوط، انگریزی تعلیم کے خلاف بے جا تعصب، پردہ اور تعلیم، اسکول کی لڑکیاں اخلاقی اصلاح، شادی، آل انڈیا ویمن کانفرنس کا اجلاس، غیر ملکوں میں عورتوں کی ترقی کی رپورٹوں کا تجزیاتی مطالعہ کلامِ نسواں میں پیش کیا ہے۔ کلام نسواں نے ایسی قلمکاروں سے بھی تعارف کرایا ہے جو اپنے مضامین بجائے اپنے نام کے مسز س م د، بنتِ نصیرالدین حیدر، م ح ف دسنوی، اے ڈبلیو جی بیگم دہلوی، افسر دُلہن، ح ن اہلیہ سراج الدین قدوائی وغیرہ وغیرہ کے نام سے لکھ رہی تھیں۔ مضامین کے لئے ان خواتین نے جو موضوعات منتخب کئے اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو آج اردو کے رسائل میں وہ تنوع نہیں ہے جن پر انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی شروعاتی دہائیوں میں ہمارے بزرگ ادیبوں نے قلم اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ جہیز کی مخالفت میں بڑی خوبصورتی سے افسر دُلہن رسالہ خاتون میں ایرانیوں کی شادی کے بارے میں لکھتی ہیں ایران میں کمسنی کی شادی بالکل عنقاء ہے۔ اگرچہ متوسط امراء میں منگنی کی رسم بہت جلد ادا کر دی جاتی ہے، لیکن شادی دولہا اور دلہن کے جوان ہونے تک نہیں ہوتی۔ مثل ہندوستان کے ایران میں بھی لڑکی کی تلاش لڑکے کے والدین کرتے ہیں۔ انتخاب کے بعد لڑکے کی ماں یا دوسری رشتہ دار عورتیں ایک انگشتری اور دوشالہ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہیں اور لڑکی کے والدین سے یہ کہتی ہیں کہ میلے دارم فلاں پسر یا در غلامی فرمایند یعنی ہماری تمنا ہے کہ آپ فلاں لڑکے کو اپنی غلامی میں قبول فرمائیں۔ اس کے بعد مہر اور جہیز کا تصفیہ بھی اسی وقت ہو جاتا ہے۔ ان امور کے طے ہونے پر دولہا کی جانب سے دلہن کی ماں کے لئے ایک کافی رقم حسب مقدور بھیجی جاتی ہے جس کو ایرانی شیر بہا (دودھ کی قیمت) کہتے ہیں۔ دلہن کی ماں کے لئے کئی خوان میوے کے اور متعدد کشتیاں لباس و زیور کی بھیجی جاتی ہیں۔ چند روز بعد شادی شروع ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں خواتین نے صحافت کے ذریعہ کس طرح اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے قلم کا استعمال کیا۔

اردو نثر پر تحقیق کرنے والے اسکالروں نے عام طور پر ۱۸۹۸ میں لاہور سے مولوی ممتاز علی کی سرپرستی میں جاری تہذیب نسواں کو اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل مولوی ممتاز علی سرسیدؔ کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے اور تعلیمِ نسواں کے بڑے حامیوں

میں سے ایک تھے۔تہذیب نسواں کی اشاعت بھی اسی مقصد کے ساتھ ہوئی،شروع میں اس رسالے کی ادارت کی ذمہ داری ان کی صاحبزادی وحیدہ بیگم یعقوب علی نے سنبھالی بعد میں ان کی دوسری بیوی محمدی بیگم کی ادارت میں تہذب نسواں شائع ہونے لگا۔قرۃ العین حیدر نے رسالہ خاتون میں شائع ایک مضمون میں تہذیب نسواں کواردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیتے ہوئے اس کا سنِ اشاعت ۱۸۸۶ لکھا ہے۔

صحافت میں بنگلہ زبان کو ہمیشہ اولیت حاصل رہی ہے۔جس طرح اردو کے پہلے اخبار جامِ جہاں نما سے قبل بنگلہ زبان کا اخبار۔۔۔آچکا تھا۔خواتین کی صحافت میں بھی بنگلہ زبان کا سفر پہلے شروع ہوااوردوسرے نمبر پر رہی اردو۔ذرائع کے مطابق یامابودھنی نام سے بنگلہ کا پہلا زنانہ رسالہ ۱۸۶۳میں کلکتہ سے جاری ہوا۔۔۔۔۔۔کلامِ نسواں کے مطابق ۱۸۷۵میں بنگلہ کا انا ینی۔۔۔ ۱۸۷۸میں پریچارکا۔۔۔کلکتہ سے ہی جاری ہوئے۔اردواور ہندی کا جہاں تک سوال ہے تو پورے وثوق سے تونہیں کہا جاسکتا کہ ہندی سے پہلے اردو میں خواتین کا رسالہ منظرعام پر آچکا تھا، لیکن ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل نے اپنے تحقیقی مقالے مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں اردوناول کا حصہ میں اردو کے دو ایسے رسالوں کا ذکر کیا ہے جو تہذیب نسواں سے پہلے شائع ہو چکے تھے۔ان کے مطابق مسلمان عورتوں میں تعلیم کی بیداری کے مقصد سے اردو کا پہلا رسالہ ۱۸۸۰ میں لکھنو سے رفیق الانساں کے نام سے جاری ہوا۔(ڈاکٹر سیمی نے رفیق الانسان کے مدیر یامدیرہ کا نام نہیں لکھا ہے) پھر ۱۸۸۴میں سید احمد دہلوی نے دہلی سے اخباالانساء نام کا رسالہ شروع کیا۔اخبارالانساء کاذکردوسرے حوالوں میں بھی ملتا ہے۔اس کے علاوہ ۱۸۸۲میں محبت حسین کا شفیق معلم نام کارسالہ حیدرآباد سے شائع ہونا شروع ہوگیا تھا۔یہ رسالہ بھی خواتین کی ذہنی بیداری اور تعلیمی ترقی کے مقصد سے شروع ہوا تھا۔دس سال بعد اس کا نام بدل کرمعلم نسواں کر دیا گیا۔محبت حسین اس حدتک خواتین کی ذہنی بیداری اور تعلیمی ترقی کے حامی تھے کہ خودکوشروع میں خادم تعلیم لکھتے تھے بعد میں خادمِ نسواں لکھنا شروع کر دیا تھا۔

اب ایک نظر ہندی میں خواتین کے اولین رسالوں پر۔انٹرنیٹ پرموجود جانکاری کے مطابق ہندی میں خواتین کا پہلا رسالہ سوگرہنی ۱۸۸۸ میں الہ آباد سے جاری ہوا۔اس کی ایڈیٹرہیمنت کماری چودھرانی تھیں،جو بنگالی تھیں اوران کے والد برہم سماج کے حامی وفعال کارکن تھے۔اس طرح سوگرہنی کو بھی برہم سماج جیسی اصلاحی تحریک کی سرپرستی حاصل تھی۔ڈاکٹر میرارانی بل نے

اپنی کتاب راشٹریہ نو جاگرن اور ہندی پتر کارتا میں خواتین کی صحافت کے حوالے سے ایک اندو نام کے رسالے کا ذکر کیا ہے، جو لاہور سے جاری ہوا اور اس کا سن اشاعت ۱۸۸۳ بتایا ہے، ایڈیٹر کا نام نہیں لکھا ہے۔ڈاکٹر میرا رانی بل کے مطابق لاہور سے ہی ایک اور پندرہ روزہ ہندی رسالہ بھارت بھاگنی ۱۸۸۸ سے نکلنا شروع ہوا۔اس رسالے کی اڈیٹر شریمتی مہا دیوی (مہا دیوی ورما نہیں) تھیں۔ڈاکٹر میرا رانی نے سوگرہنی کا سنِ اشاعت ۱۸۸۹ لکھا ہے، جبکہ انٹرنیٹ پر ۱۸۸۸ ہے۔

کلامِ نسواں نے ہندی رسائل کے حوالے سے سارن سے نکلنے والے ایک زنانے رسالے مہلا درپن کے بارے میں جانکاری دی ہے کہ ۸۰ کی آخری دہائیوں میں عورتوں پر مرکوز رسالہ نکلا جس کی ایڈیٹر اور پبلشر شریمتی شاردا دیوی تھیں۔آگے کلامِ نسواں میں الہ آباد سے نکلنے والے رسالے گرہ لکشمی (۱۹۰۹) مدیرہ شریمتی گوپال دیوی، اسی سال الہ آباد سے ہی استری درپن مدیرہ رامیشوری نہرہ، ۱۹۲۲ میں الہ آباد سے چاند ان تین ہندی رسالوں کا ذکر کیا ہے۔اہم بات یہ ہے کہ کلام نسواں نے بیسویں صدی سے قبل شائع ہونے والے خواتین کے جس ہندی رسالے مہلا درپن کا ذکر کیا ہے مگر اس کا سن اشاعت نہیں بتایا۔ڈاکٹر میرا رانی بل نے بھی لاہور سے ۱۸۸۳ میں جاری اندو کے بارے میں مدیرہ کا نام اور مزید جانکاری نہیں دی ہے۔جبکہ ڈاکٹر سیمی ثمر فضل تہذیب نسواں سے پہلے ۱۸۸۰ میں لکھنو سے جاری رفیق الانساء کا ذکر کرتی ہیں تو اس روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں بھی خواتین نے ہندی پر سبقت حاصل کی، تاہم اردو۔ہندی کے اولین زنانہ رسالوں کے حوالے سے کوئی رائے قائم کرنا ابھی جلد بازی ہوگی، کیونکہ اس موضوع پر تحقیق کی مزید گنجائش برقرار ہے۔

اردو۔ہندی میں خواتین کے اولین جریدوں کے بارے میں جو باتیں قدر مشترک ہیں وہ یہ کہ صحافت کے میدان میں بطور رائٹر، ایڈیٹر یا پبلشر جن خواتین نے قدم رکھا، ان کا تعلق متوسط اعلیٰ طبقے سے تھا، دوسرے انہیں اپنے گھر کے مردوں والد یا شوہر کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔یہ خواتین اس وقت کے حساب سے تعلیم یافتہ تھیں۔گھر کے مرد افراد جدید مغربی تعلیم اور اس کے فوائد سے بخوبی واقف تھے۔اور ان میں سے کئی خود انگلستان یا دوسرے ممالک کی تعلیمی و سماجی ترقی سے متاثر تھے۔اس کے علاوہ جن لوگوں نے آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں کا بیڑا اٹھایا وہ کسی نہ کسی سماجی تحریک سے منسلک تھے۔جیسے ہندی صحافت برہم سماج، آریہ سماج تحریک کی سرپرستی میں آگے بڑھ رہی تھی تو اردو میں خواتین کی صحافت پر سرسید تحریک، ڈپٹی

نذیر احمد کی سماجی اصلاحی کوششوں اور سید احمد دہلوی کی تحریک کے اثرات کا سایہ تھا۔ سجاد حیدر یلدرم ترکی میں انقلابی تبدیلیوں سے بیحد متاثر تھے، انہوں نے اس مہم میں اپنی اہلیہ نذر سجاد کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔ شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں نے تو علی گڑھ میں لڑکیوں کا مدرسہ کھولنے کے ساتھ لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنے کے لئے ہی خاتون اور پھر راز ترقی جیسے رسالوں کی اشاعت شروع کی اور اس کام کے لئے ان کی اہلیہ اور بیٹیوں نے مورچہ سنبھالا۔ بنگلہ کے مشہور ادیب ربیندر ناتھ ٹیگور کی بہن اور بھانجی کو اپنے بھائی اور شوہر کی سرپرستی حاصل تھی، یہی حال ہندی صحافت کا تھا۔

البتہ ایک فرق یہ تھا کہ بنگلہ اور ہندی کے اولین خواتین کے رسالے خواتین کی ادارت میں ہی نکلنے شروع ہوئے، جبکہ اردو میں شمالی ہند میں سید احمد دہلوی (اخبار الانساں) عبدالحلیم شرر (پردہ عصمت) اور دکن میں محب حسین (معلم شفیق و معلم نسواں) نے خواتین کی ذہنی تربیت کے لئے صحافت کا بیڑا اٹھایا ان کی حوصلہ افزائی سے خواتین نے ماہناموں ہفت روزہ کے ذریعہ اردو صحافت کے میدان میں پہلا قدم رکھنے کی جرأت کی۔

اردو میں خواتین کے رسالے کی اولیت کے حوالے سے ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ ٹی وی اینکر ڈاکٹر شگفتہ یاسمین کی ۲۰۱۴ میں شائع کتاب اردو میں خواتین کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے میں شریف بی بی کو اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ قرار دیا وہ لکھتی ہیں خواتین کے لئے پہلا رسالہ شریف بی بی کے نام سے محبوب عالم نے لاہور سے جاری کیا۔ لیکن ڈاکٹر شگفتہ نے شریف بی بی کا سنِ اشاعت نہیں بتایا۔ اگلی سطر میں حیدر آباد سے محب حسین کے ذریعہ خواتین کے لئے نکالے گئے معلم نسواں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ اس میں مردوں کے علاوہ خواتین کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ معلم نسواں کا سن اشاعت ۱۸۹۲ لکھا ہے جو صحیح ہے، لیکن معلم نسواں کے اڈیٹر کا نام درج نہیں ہے۔ جبکہ ابھی تک اس موضوع پر تحقیق کرنے والے تمام حوالوں میں صاف لکھا ہے کہ محب حسین نے ۱۸۹۲ میں حیدر آباد سے معلم نسواں جاری کیا تھا، بلکہ اس سے دس سال پہلے ۱۸۸۲ میں انھوں نے خواتین کے مسائل اور دلچسپی کو مرکز میں رکھتے ہوئے معلم شفیق کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا بعد میں اسی کا نام بدل کر معلم نسواں کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین شریف بی بی کو بغیر سن اشاعت بتائے اردو میں خواتین کا پہلا رسالہ بتا رہی ہیں، پھر دوسرے پیراگراف میں عصمت کے بارے میں لکھ رہی ہیں کہ ۱۵ جون

۱۸۸۰ میں دہلی سے علامہ راشد الخیری نے عصمت جاری کیا جو ادبی و علمی لحاظ سے خواتین کا پہلا مجلّہ تھا۔ اردو کے رسائل نسواں میں سب سے اہم دو رسالے تہذیب نسواں اور خاتون کا ذکر بھی ڈاکٹر شگفتہ نے سرسری انداز میں کیا ہے۔ تہذیب نسواں کے سنِ اشاعت اور جائے اشاعت کا تذکرہ ہی نہیں ہے، صرف مدیرہ اور سرپرست کے نام دئے ہیں، خاتون کا سنِ اشاعت اور جائے اشاعت لکھا ہے تو مدیرہ کا نام نہیں بتایا۔ لیکن اس کے بعد بیسویں صدی کی شروعاتی دہائیوں میں نکلنے والے تقریباً تمام اہم رسالوں کے نام گنائے ہیں۔ بلکہ انہوں نے کچھ ایسے رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جن کا حوالہ دوسرے تحقیقی مقالوں میں نہیں ہے۔ جیسے ماہ نامہ تنویر، لیلیٰ، الزہرا، سہاگ، صدائے نسواں، خادم نسواں (بہت ممکن ہے کہ خادم نسواں کوئی الگ سے رسالہ نہ ہو کیونکہ معلم نسواں کو جاری کرنے والے محب حسین نے خود کو خادم نسواں لکھنا شروع کر دیا تھا، معلم نسواں کے سرورق پر اپنے نام کے ساتھ وہ خادم نسواں لکھتے تھے)۔ ڈاکٹر شگفتی یاسمین نے اپنی کتاب میں خواتین کے تقریباً ۲۹ اردو رسالوں کا ذکر کیا ہے، لیکن جائے اشاعت، سن اشاعت میں احتیاط نہیں برتی گئی۔

دراصل ڈاکٹر شگفتہ کی یہ کتاب رسائل نسواں پر تحقیقی کام نہیں ہے، بلکہ دو تین غیر ملکی اداروں کے بارے میں تحریر ہے اور اردو میں خواتین کے رسائل کے بارے میں انہوں نے دو۔ڈھائی صفحوں میں ضمنی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ طلبا جو اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں یا مستقبل میں کریں گے، ان کے لئے یہ تحریر تحقیقی نقط نظر سے سودمند نہیں ہے۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن فیم معروف فلم ٹی وی اداکارہ اینکر تبسم نے اپنے ایک تفصیلی انٹرویو میں اس بات کی جانکاری دی ہے کہ ان کی والدہ اصغری بیگم صحافی تھیں۔ تبسم کے مطابق ان کے والد اجودھیا ناتھ سچدیو جو پنجابی ہندو تھے، شہید بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے تھے اور ان کی والدہ اصغری بیگم مسلمان تھیں۔ دونوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا اور دونوں اردو روزنامہ تیج (دہلی) میں کام کرتے تھے بعد میں بمبئی منتقل ہو گئے۔ وہ بتاتی ہیں کہ بمبئی آ کر میری والدہ نے عبدالحمید انصاری (مڈ ڈے گروپ کے خالد انصاری کے والد) کی مدد سے تنویر نام کا ماہنامہ نکالنا شروع کیا، جس میں جگر مرادآبادی، مجروح سلطان پوری، جوش ملیح آبادی، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جریدہ خواتین کے مسائل اور حقوقِ نسواں پر مبنی نہیں بلکہ ایک ادبی رسالہ رہا ہوگا، جس کی مدیرہ ایک خاتون تھیں۔

روزنامہ تیج میں اصغری بیگم بحیثیت سب ایڈیٹر یا پروف ریڈر کام کرتی ہوں گی لیکن اس زمانے میں کسی اردو روزنامہ میں ایک عورت کا کام کرنا واقعی بڑے حوصلے کا کام تھا۔ بمبئی میں اصغری بیگم نے اس وقت کی مشہور اداکارہ کملا کوٹنیش اور گووندا کے والد ارون آہوجہ کو بھی اردو پڑھائی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت کاغذ مہنگا ہو جانے کے سبب تنویر کی اشاعت بند کرنی پڑی۔ ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے اپنی کتاب میں اس رسالے کا ذکر کیا ہے، البتہ جائے اشاعت سن اشاعت اور مدیر کے نام کا ذکر نہیں ہے۔

جس زمانے میں بنگلہ، اردو اور ہندی میں خواتین کے رسالے نکلنے شروع ہوئے وہ برصغیر میں سیاسی۔سماجی تبدیلی کا دور تھا۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج تحریک، سوامی وویکا نند کا رام کرشن مشن اور مسلمانوں میں سر سید احمد خاں کی تعلیمی اصلاحی تحریک، ڈپٹی نذیر احمد اور سید احمد دہلوی کے ذریعہ اصلاح معاشرہ کے علاوہ علی گڑھ میں شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں کے ذریعہ آزادیٔ نسواں اور تعلیم نسواں و تہذیبی ترقی کے ضمن میں اصلاحی تحریکوں نے ملک میں دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ خواتین کے لئے بھی ایک سازگار ماحول تیار کر دیا تھا۔ بھوپال میں نواب بیگم سلطان جہاں اور ان سے قبل دو اور بیگمات کی روشن خیالی۔ علم دوستی نے عورتوں کو ایک قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تو جنوبی ہندوستان میں حیدرآباد کی علمی و ادبی فضا میں کئی روشن خیال خواتین اپنی تخلیقات کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ کچھ یہی صورتحال پنجاب، بنگال، مہاراشٹر، اتر پردیش کے بڑے شہروں کی بھی تھی۔ اصلاحی تحریکوں کے علاوہ عیسائی مشنریوں اور ذاتی طور پر کچھ انگریزوں کی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ڈیوڈ ہیئر ڈ اور اینی بیسنٹ کے نام اہم ہیں۔ انگلینڈ اور جاپان میں لڑکیوں کے لئے یونیورسٹیوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ مسلم ممالک ترکی اور مصر میں تعلیم نسواں اور آزادیٔ نسواں کی تحریکوں نے پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔ ایک طرف مغربی جدید علوم، دوسری طرف روایتی دقیانوسی انداز فکر نے مسلمانوں کو سوچنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔

بیسویں صدی کی شروعات بہت خوش آئند ثابت ہوئی۔ ۱۹۰۰ میں لکھنو سے مولوی عبدالحلیم شرر نے پردہ عصمت نکالا۔ علی گڑھ سے ۵۰۔۱۹۴۰ میں شیخ عبداللہ کی قیادت اور ان کی روشن خیال بیٹی ڈاکٹر رشید جہاں کی سرپرستی میں دو بڑے کام ہوئے۔ اول پہلی مسلم ویمن کانفرنس کا انعقاد، جس میں بھوپال کی نواب بیگم سلطان جہاں، بیگم حبیب الرحمان شیروانی، نذر سجاد حیدر، بیگم ہمایوں

صغرامرزا، بیگم امتیاز علی تاج، محمدی بیگم کے علاوہ دوسرے علاقوں کی تعلیم یافتہ خواتین نے شرکت کی تھی۔ دوسرا اہم کام اس سال خواتین کا سب سے اہم مقبول رسالہ خاتون کی اشاعت ہے۔ اس رسالے کے جاری ہونے کے بعد ان خواتین کو بڑی تقویت ملی جو قلم اٹھا کر اپنے دل کی بات سے اپنی دوسری بہنوں کو بتانا چاہتی تھیں۔ ابتدائی رسالوں میں ادبی صحافت کا اہم رول رہا ہے۔ اس طرح خواتین کی ناول نگاری کا ارتقاء ان اولین اردو رسالوں کے ذریعہ ہوا۔

۱۹۰۸ میں دہلی سے علامہ راشد الخیری نے عورتوں کی اصلاح اور مشرقی تہذیب کے تحفظ کے لئے عصمت جاری کیا۔ ۱۹۰۹ میں ماہنامہ الحجاب محمد قیصر کی ادارت میں بھوپال سے نکلنا شروع ہوا۔ جہاں تک علامہ راشد الخیری کے عصمت کا سوال ہے وہ تعلیم نسواں (جدید) اور آزادی نسواں کی حمائت میں نکلنے والے دوسرے رسائل سے مختلف علامہ کی سوچ کے مطابق مسلم گھرانوں میں روایتی آئیڈل بہو۔ بیٹیوں کی تربیت پر زور دے رہا تھا۔ مشرقی معاشرے پر مغربی اثرات کے برے نتائج اور توہم پرستی کی مخالفت جیسے موضوعات تک یہ رسالہ محدود تھا۔ جبکہ پاپا میاں کی رہنمائی میں علی گڑھ سے شائع خاتون نے مسلم خواتین کو ایک ۔۔۔ ویژن ایک جدید نظریہ فکر عطا کیا۔ ماڈرن ہندوستان کے لئے گھر کی چار دیواری سے نکل کر مسلم خواتین کی ذہن سازی میں خاتون کا اہم رول رہا ہے۔ خاتون میں چھپنے والے مضامین، افسانوں اور قسط وار ناولوں میں جدید تعلیم، عورتوں کے حقوق ان کی آزادی، صحت نسواں، سماج میں عورتوں کی ثانوی حیثیت، دیسی تحریکوں میں خواتین کی شرکت، وطن پرستی اور مغربی علوم کے فائدوں کا ذکر ہوتا تھا۔ ناولوں کے نسوانی کرداروں کے ذریعہ قارئین کو سیکولر نظریہ فکر اور بیرونی رجحانات سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ یہ کردار کہیں عدم تعاون کی تحریک میں فعال نظر آتے ہیں، تو کہیں سماجی اصلاح کی تحریکوں سے وابستہ۔ اس دور میں خواتین کے مسائل پر سنجیدہ فکر اور مقصد کے ساتھ لکھنے والی خواتین کی ایک چھوٹی سی فوج تیار ہوگئی اور انہیں کمک مل رہی تھی ان کے گھر کے مردوں یعنی والد، شوہر یا بھائیوں کی طرف سے۔ ان میں محمدی بیگم، عباسی بیگم، اعلیٰ بی، نذر سجاد حیدر، بیگم شیروانی، بیگم امتیاز علی تاج، رشید جہاں، صغرا ہمایوں مرزا، بیگم شہنواز، فاطمہ بیگم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

صحافت کے میدان میں شمالی ہند میں خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے جو کام پاپا میاں اور مولوی ممتاز علی اور ان کے گھرانے کی عورتوں نے کیا دکن میں خود کو خادم نسواں کہنے والے محبّ حسین کچھ

سال پہلے حیدرآباد میں شروع کر چکے تھے۔۱۸۸۲ میں محبّ حسین نے معلم شفیق نام سے ایک رسالے کی شروعات کی پھر دس سال بعد اس کا نام بدل کر معلم نسواں کر دیا۔ان کا مقصد عورتوں کی ذہنی بیداری، سماجی اصلاح اور ترکی و مصر ترقی پذیر ممالک کی طرز پر ہندوستانی عورتوں کی تربیت کرنا تھا۔

مجموعی طور پر اس وقت متوسط مسلم گھرانوں کی تعلیمی صورتحال افسوسناک تھی، تاہم اس طبقہ کی خواتین نے جن کا تعلق تعلیم یافتہ، روشن خیال اور خوشحال گھرانوں سے تھا انہوں نے آندھی میں چراغ جلانے کا فریضہ انجام دیا۔ان کی پیش قدمی نے آنے والی ایک نسل کو متاثر کیا۔خواتین کو گھر میں ان کی خانگی حیثیت اور گھر سے باہر ان کی سماجی قوت (سوشل پاور) کا احساس دلایا۔ملک اور بیرون ملک جو خواتین مختلف میدان میں نمایاں کام انجام دے رہی تھیں، ان کی باقاعدہ رپورٹ شائع ہوتی تھیں۔ترکی اور مصر میں، شرعی قوانین میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے اور خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مظالم کی رپورٹنگ بھی معلم نسواں میں ہوتی تھی۔ خواتین کے اولین رسالوں میں ایک چیز قدر مشترک تھی وہ تھی ادبی صحافت، جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصد کے ساتھ قارئین تک پہونچتی تھیں۔ براہِ سیاسی صحافت اور روزناموں میں ان کی حصہ داری شروعاتی دور میں نہیں ملتی بلکہ ۲۰ویں صدی کی ۹ویں ۱۰ویں دہائی کے بعد سب سے پہلی مثال ہمیں قومی آواز میں نورجہاں ثروت کی ملتی ہے۔انہوں نے خود ایک مضمون میں اس بات کا انکشاف کیا ہے۔ مجھے بذاتِ خود اس بات کا تجربہ ہے کیونکہ ۸۷۔۱۹۸۶ میں موہن چراغی قومی آواز میں میرا تقرر کرانا چاہتے تھے لیکن ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سعی میں ناکام رہے۔۱۹۹۱ میں جب اردو ماہنامہ راشٹریہ سہارا کی شروعات ہوئی تو لڑکیوں کے لئے بھی دروازہ کھل گیا۔پھر روزنامہ شروع ہوا تو کئی لڑکیوں کا تقرر ہوا۔

روزناموں میں خواتین کی شرکت سے پہلے، دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ بانو کا ذکر ضروری ہے جو ۱۹۴۶ میں انور علی کی ادارت میں شائع ہوا پھر ۱۹۵۷ سے شمع پبلیکشنز سے منسلک ہو گیا اور زینت کوثر دہلوی کی ادارت میں ایک عرصے تک قارئین کو متاثر کیا۔۱۹۲۹ میں میرٹھ سے ڈاکٹر حشمت آرا کی ادارت میں جاری خاتون مشرق کے سامعین کا بھی ایک الگ حلقہ تھا۔خاتون مشرق جو ابھی تک دہلی سے شائع ہو رہا ہے، وہ اسی کا سلسلہ ہے یا دوسرا رسالہ ہے۔اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

بمبئی سے ۱۹۴۰ میں شائع ہونے والے پندرہ روزہ رسالہ رہبر مسلسل ۲۰ برس تک مخصوص حلقہ

سامعین کے درمیان اہم رول ادا کیا تھا۔ اس کی مدیرہ بھی کسی معمولی حیثیت کی خاتون نہیں تھیں اور نہ ان کا مقصد۔ اردو والوں کو شائد جان کر تعجب ہو کہ اردو، دیوناگری اور گجراتی یعنی تین رسم الخط میں ایک ساتھ شائع ہونے والے رہبر کی مدیرہ معروف ریڈیو اینکر براڈ کاسٹر امین سیانی کی والدہ پدم شری کلثوم سیانی تھیں، جنہوں نے مہاراشٹر میں غریب خاندان کی عورتوں کی تعلیم کے لئے مہم شروع کی۔ تعلیم نسواں۔ تعلیم بالغاں کے علاوہ ۱۹۴۰ سے لے کر ۱۹۶۰ تک رہبر کو تین زبانوں میں شائع کرتے ہوئے مسلسل ۲۰ سال تک بطور مدیر یہ ذمہ داری بخوبی نبھائی۔ دراصل یہ رسالہ گاندھی جی کے لسانی فارمولے ایک زبان۔ دو رسم الخط ہندوستانی کو ملک میں رائج کرنے کے لئے نکالا گیا تھا۔ ملک کی مختلف جیلوں میں بند سیاسی قیدیوں کے درمیان رہبر بیحد مقبول ہوا۔ کلثوم سیانی کو لکھے گئے گاندھی جی کے خطوط کی روشنی میں اس جریدے کی اشاعت کا مقصد سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں نے اس اہم رسالے کے ذکر کو بھی فراموش کیا ہے۔ کلثوم سیانی کی صحافتی خدمات کی جانکاری بھی انگریزی کے ذریعہ ملی۔ مندرجہ بالا جن تحقیقی مقالوں اور اردو صحافت پر مرتب کتابوں کا ذکر ہے ان میں کہیں رہبر اور اس کی مدیرہ کلثوم سیانی کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس بیزاری کی شائد ایک وجہ اس کا تین رسم الخط میں شائع ہونا اور ملی جلی زبان ہے۔ مئی ۲۰۱۶ اردو دنیا کے صحافت نمبر میں کلثوم سیانی ان کے صحافی خدمات کا ذکر ایک انٹرویو میں ان کے صاحبزادے امین سیانی نے کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ بطور صحافی ان کی تربیت رہبر کے لئے والدہ کے کام میں مدد کرنے کے دوران ہوئی۔ لہجہ کا منفرد انداز، زبان و بیان کی روانی اور صحیح تلفظ والدہ کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

خواتین کی اردو صحافت کے باب میں عروسِ نو اور شمس النسا جیسے رسالوں جن کا تعلق بالا خانوں کی رخشندہ و تاریک گلیوں سے ہے، ان کا ذکر نا گزیر ہے۔ طوائفوں کی دلچسپی اور مسائل کو مرکز میں رکھتے ہوئے خود اس طبقے کے ذریعہ جاری ہونے والے ایسے منفرد رسالوں کو بھی ہمارے مصنفین نے نظر انداز کیا ہے۔ جبکہ معاشی اور سماجی نقطۂ نظر سے ان رسالوں کے مضامین کا مطالعہ و تجزیہ اہم نتائج اخذ کرنے میں مددگار ہوگا۔ ہماری زبان میں وشوناتھ طاؤس نے اپنی یادداشت کی بناء پر عروسِ نو کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مضمون کے بعد اسی پرچے میں پٹنہ سے عطا عابدی نے چند مفروضات کے ساتھ ڈاکٹر لطیف احمد سبحانی کی کتاب و در بھ میں اردو صحافت کے حوالے سے شمس النساء جس کی ایڈیٹر اللہ دی نزاکت مراشن تھیں کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے علاوہ بھی

بالاخانوں سے کئی اردو رسالے نکلتے ہیں۔ اس سمت میں بھی تحقیق کی گنجائش ہے۔

موجودہ زمانے میں خواتین کی ادارت میں دہلی، علیگڑھ، بنگلور، سرینگر کشمیر سے کئی اردو ماہنامے، سالنامے نکل رہے ہیں لیکن مضامین کے تنوع کا فقدان اور معیار کی پستی کا شکار ہیں۔ ہماری بزرگ صحافیوں کا صحافت کے تعین نقطۂ نظر اور مقصد بہت واضح تھا۔ پوری دیانت داری کے ساتھ انہوں نے صحافت کی ذمہ داری کو نبھایا، بھلے ہی روزناموں و سیاسی صحافت سے ان کی وابستگی ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ یہ کہنے میں عار نہیں کہ آج دوسری زبانوں کے مقابلے میں خواتین کی اردو صحافت کا معیار زوال پذیر ہے، موضوعات محدود اور وژن کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔

فہرست: رسائل نسواں

۱۸۸۰ ۔ رفیق الانسا ۔ (ایڈیٹر کا نام درج نہیں) ۔ لکھنؤ

۱۸۸۲ ۔ معلمِ شفیق ۔ اڈیٹر۔ محب حسین ۔ حیدرآباد

۱۸۸۴ ۔ اخبار الانسا ۔ اڈیٹر۔ سید احمد دہلوی ۔ دہلی

۱۸۹۰ ۔ پردۂ عصمت ۔ اڈیٹر۔ عبدالحلیم شرر ۔ لکھنؤ

۱۸۹۲ ۔ معلم نسواں ۔ اڈیٹر۔ محب حسین ۔ حیدرآباد

۱۸۹۸ ۔ تہذیب نسواں ۔ اڈیٹر۔ بیگم یعقوب و محمدی بیگم ۔ لاہور

۵۔۱۹۰۴۔ خاتون ۔ اڈیٹر۔ شیخ عبداللہ عرف پاپامیاں ۔ علیگڑھ

۱۹۰۸ ۔ عصمت ۔ اڈیٹر۔ علامہ راشدالخیری و بیگم اکرام ۔ دہلی

۱۹۰۹ ۔ الحجاب ۔ اڈیٹر۔ قیصر ۔ بھوپال

۱۹۱۶ ۔ نور ۔ اڈیٹر۔ مولوی محمد بدیع الدین ۔ مدراس

۱۹۱۹ ۔ دائی ۔ اڈیٹر۔ سلطان جہاں بیگم چنگیزی ۔ دہلی

۱۹۱۹ ۔ الانسا ۔ اڈیٹر۔ صغرا بیگم ہمایوں مرزا سحر ۔ حیدرآباد

۱۹۱۹ ۔ استانی ۔ اڈیٹر۔ بانو بیگم خواجہ ۔ دہلی

۱۹۲۳ ۔ خادمہ ۔ اڈیٹر۔ مریم بیگم۔ حیدرآباد

۱۹۲۳ ۔ حور ۔ اڈیٹر۔ بیگم صدیق۔ بنگال

۱۹۲۵ ۔ سرتاج ۔ اڈیٹر۔ قمر جہاں بیگم ۔ ملتان، پنجاب ۶

۱۹۲۶ ۔ تبلیغ نسواں ۔ اڈیٹر۔ بیگم خواجہ بانو ۔ دہلی

۱۹۲۶۔　معین نسواں۔　اڈیٹر۔عطیہ بیگم ۔ ۔ ۔ ؟

۱۹۲۶۔　عفت　۔　اڈیٹر۔صالحہ خاتون ۔ بہار (شگفتہ یاسمین نے اسے بہار کا واحد زنانہ مجلّہ بتایا ہے)

۱۹۲۶۔　نور۔　اڈیٹر۔سعادت سلطانہ۔امرتسر پنجاب (شگفتہ یاسمین کے مطابق نور جہاں)

۱۹۲۸۔　ثریا　۔　اڈیٹر۔رضیہ وسلمہ۔ لاہور

۱۹۲۸۔　عروسِ نو۔　اڈیٹر۔شمیم پتلی بائی　۔　؟(بالا خانے سے جاری)

۱۹۲۹۔　ہمجولی۔　اڈیٹر۔بیگم ابوبکر خویشی　۔ حیدرآباد

۱۹۲۹۔　سفینہ نسواں۔　اڈیٹر۔صادقہ قریشی　۔ حیدرآباد

۱۹۲۹۔　خاتون مشرق۔ ڈاکٹر حشمت آرا ۔ میرٹھ

؟؟؟۔　گلابی کرن　۔　اڈیٹر۔درشن دیال مہتہ، پشپا رانی، سائرہ بیگم فاروقی۔ میرٹھ

۱۹۳۳۔　بُلبُل۔　اڈیٹر۔؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

۱۹۳۶۔　حرم۔　اڈیٹر۔ڈاکٹر بیگم عبدالغفور　۔ پیلی بھیت، یوپی

۱۹۳۶۔　مُسلمہ۔　اڈیٹر۔تمیرہ بیگم　۔ جالندھر، پنجاب

۱۹۴۰۔　رہبر۔　اڈیٹر۔کلثوم سیانی　۔ بمبئی

(اردو،　دیوناگری، اور　گجراتی تینوں زبان سب کی ایک ہوتی تھی) رسم الخط میں شائع ہوتا تھا۔ملی جلی

۱۹۴۶ ۔　رازِ ترقی　۔　اڈیٹر۔شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں　۔ علیگڑھ

۱۹۴۶۔۴۷۔ بیگم　۔　اڈیٹر۔بیگم نور جہاں ۔ (کلکتہ سے جاری ہوا، تقسیم کے بعد بنگلہ دیش منتقل ہو گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ زبان اردو تھی یا بنگلہ)

۱۹۴۶ ۔　بانو　۔　اڈیٹر۔انور علی دہلوی۔ دہلی

۱۹۵۷ ۔　بانو　۔　اڈیٹر۔زینت کوثر دہلوی　۔ دہلی

(۱۹۵۷　سے یہ رسالہ شمع　پبلیکیشنز سے منسلک ہو گیا اور اس کی ادارت زینت کوثر نے سنبھالی)

۱۹۵۰ ۔　(وشونا تھ طاؤس کے مطابق طوائفوں کا ایک اور رسالہ لاہور سے جاری ہوا، طاؤس کو اس کا نام یاد نہیں ہے)۔

۱۹۵۲ ۔　شمس الانہار۔　اڈیٹر۔اللہ دی نزاکت　۔ مسجد تہور خان دہلی

۱۹۵۴ ۔　شعور　۔　اڈیٹر۔اختر جہاں　۔ حیدرآباد

۱۹۵۵ ۔ نجمہ (ہفتہ وار) ۔ اڈیٹر۔سید یوسف ۔ مدراس
۱۹۵۷ ۔ پردہ نشین ۔ اڈیٹر۔مسز احتشام (خاموش پبلیشر) ۔ آگرہ
(شگفتہ یاسمین نے اس کا سنِ اشاعت ۱۹۰۴ بتایا ہے)
۱۹۵۸ ۔ عصمت ۔ اڈیٹر۔شیخ محمد اکرام وان کی اہلیہ ؟؟؟
۱۹۲۵ ۔ معلمِ شفیق ۔ اڈیٹر۔محب حسین ۔ حیدرآباد
؟؟ ۔ باجی ۔ اڈیٹر۔وحیدہ بیگم ۔ دہلی
۱۹۹۹ ۔ محفل صنم (ماہنامہ) ۔ اڈیٹر۔شہلا نواب۔دہلی (۲۰۰٦ تک شائع ہوتا رہا)
۱۹۵۹ ۔ پاکیزہ (ہفت روزہ) ۔ اڈیٹر۔بیگم جواہر نگار، جوہر فاروقی۔تامل ناڈو
۱۹٦۰ ۔ سرکار ۔ اڈیٹر۔بیگم خورشید حسین ۔ تامل ناڈو
۱۹٦۲ ۔ خاتون دکن ۔ اڈیٹر۔صالحہ الطاف حسین ۔ حیدرآباد
(سب ایڈیٹر صبیحہ سعید، عذرا سعید، رخشاں بخشی۔اس رسالے کی آرٹسٹ بھی خاتون تھیں)
۱۹٦۳ ۔ جلترنگ۔ اڈیٹر۔بیگ عارف مدراسی ۔ تمل ناڈو
۱۹٦۳ ۔ قلمکار ۔ اڈیٹر۔احمدی بیگم ۔ حیدرآباد
۱۹۷۲ ۔ روشی ۔ اڈیٹر۔ڈاکٹر رونق جہاں زیدی ۔ میرٹھ
؟؟ ۔ بزمِ ادب (سالنامہ)۔اڈیٹر۔راشدہ خلیل (بیگم خلیل الرحمان اعظمی)۔ علیگڑھ
؟؟ ۔ زریں شعائیں ۔ اڈیٹر۔فریدہ رحمت اللہ ۔ بنگلور
؟؟ ۔ افشاں ۔ اڈیٹر۔اشتیاق عارف ۔ بھوپال
؟؟ ۔ ظل سبحان ۔ اڈیٹر۔۔۔۔۔۔ ۔ بھوپال
؟؟ ۔ سب رنگ نو ۔ اڈیٹر۔ڈاکٹر شاہدہ صدیقی ۔ ؟؟
؟؟ ۔ صدا ۔ اڈیٹر۔نسرین نقاش ۔ سرینگر، کشمیر
؟؟ ۔ شمس ۔ اڈیٹر۔فرزانہ فرحت، رخشندہ کوکب۔ ؟؟
؟؟ ۔ غبارہ (خواتین نمبر) ۔ اڈیٹر۔فوزیہ چودھری۔ حیدرآباد
؟؟ ۔ دیدہ ور ۔ اڈیٹر۔۔۔۔۔ ۔ اردو کلب، علیگڑھ
؟؟ ۔ سویرا ۔ اڈیٹر۔ڈاکٹر عالیہ قیصر، شاہدہ نیازی، اِرم ہاشمی ۔ ؟؟

❁❁❁

کتابوں کی باتیں

کتاب : مثنوی چراغ دیر مع پانچ اردو تراجم

مرتب : پروفیسر صادق

پبلیشر : اردو اکادمی دہلی، سی پی او بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ 110006

سنِ اشاعت : 2015

قیمت : 45روپے

مبصر : ڈاکٹر ظفر محمود، مادھو کالج، اجین

بین الاقوامی شہرت کے حامل عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے نہ صرف اپنی غزلوں اور مکتوبات کے ذریعہ اردو ادب کو سمت و رفتار عطا کی بلکہ اپنی مثنویوں سے بھی دنیائے ادب میں اپنا منفرد مقام بنایا۔ غالبؔ نے گیارہ مثنویاں لکھیں جو فارسی زبان میں تھیں۔ ان مثنویوں میں ''گہر بار''، ''بادِ مخالف''، ''در صفتِ انبہ''، ''دعائے صباح''، اور ''چراغ دیر'' زیادہ مشہور ہوئیں۔ ''چراغِ دیر'' ان کی تمام مثنویوں میں سب سے زیادہ ادبی اہمیت کی حامل مانی جاتی ہے۔

پروفیسر صادق عہدِ وسطیٰ کی تاریخ و ثقافت اور ادبیاتِ ہند کے عالم کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے کاموں میں کبھی بھی دیانت داری اور سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تحقیق و تنقید کے معیاری اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے پروفیسر صادق نے زیرِ تبصرہ کتاب ''مثنوی چراغ دیر مع پانچ اردو تراجم'' کی ترتیب و تدوین میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ یوں تو اس مثنوی کے کئی ترجمے ہوئے ہیں لیکن پروفیسر صادق نے ان میں سے پانچ اہم فنکاروں کے تراجم کو جمع کر کے ایک مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ اپنی اس کتاب میں پیش کیا۔ جن فنکاروں کے تراجم کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: ۱۔ ظ۔ انصاری، ۲۔ اختر حسن، ۳۔ علی سردار جعفری، ۴۔ حنیف نقوی اور ۵۔ کالیداس گپتا رضا۔

غالبؔ کی اس مایہ ناز مثنوی کے ترجموں کا تجزیہ اور اس کے پس منظر کا تذکرہ پروفیسر صادق نے اپنے طویل تعارفی مضمون میں بڑے مربوط انداز میں کیا ہے۔ ان کا یہ مضمون تقریباً گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ غالبؔ نے دتی سے کلکتہ کا بڑا طویل سفر کیا تھا۔ راستے میں اہم مقامات کانپور، الہ آباد لکھنؤ، بنارس اور پٹنہ میں انہوں نے قیام کیا تھا۔ سفر کے دوران غالبؔ نے کچھ عرصہ بنارس میں بھی قیام

کیا تھا اور وہیں اپنی مثنوی ''چراغ دیر'' تخلیق کی۔ غالب دلی سے کلکتہ کے لئے جنوری 1826ء میں روانہ ہوئے۔ وہاں وہ خاندانی پینشن کے معاملے میں ہونے والی ناانصافی کے خلاف مقدمہ لڑنے کی غرض سے نکلے تھے۔ یہ سفر ان کی زندگی کا سب سے لمبا اور دشوار گزار سفر تھا۔ اس سفر کے دوران انہیں بڑی ذہنی اور جسمانی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ غالب 19 فروری 1828ء کو کلکتہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ڈیڑھ سال تک مقدمہ کی پیروی کرتے رہے مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ اگرچہ مادی نقطۂ نظر سے انہیں ناکامی ملی لیکن ادبی لحاظ سے انہوں نے مثنوی ''چراغ دیر'' تخلیق کر کے ایک بڑا کارِ نمایاں سرانجام دیا۔ محققین اس مثنوی کی جائے تخلیق بنارس کی سرزمین مانتے ہیں۔ ''چراغ دیر'' لکھنے سے پہلے بھی غالب فارسی کی دو مثنویاں ''سرمۂ بینش'' اور ''درد و داغ'' قلمبند کر چکے تھے۔ مرزا غالب کی مادری زبان اردو تھی اور پدری زبان فارسی۔ انہیں ان دونوں زبانوں پر برابر کا ملکہ حاصل تھا۔ ''چراغ دیر'' ہندوستانی ماحول و اقدار کی نمائندگی کرنے والی فارسی کی شاہکار مثنوی ہے۔

اس مثنوی کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سنسکرت زبان میں بھی اس کے دو ترجمے، راشٹریہ سنسکرت سنستھان، دہلی اور پنڈت جگن ناتھ پاٹھک کا کیا ہوا ترجمہ، منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ''غالب کاویم'' عنوان سے سنسکرت میں دیوانِ غالب کا منظوم ترجمہ بھی 2003ء میں منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ پروفیسر صادق اپنے پس نوشت میں رقم طراز ہیں کہ ان پانچ تراجم کے علاوہ تین ترجمے اور ہو چکے ہیں ان میں سے ایک مسلم الحریری کا ہے جو منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ دوسرا ترجمہ خرد فیض آبادی نے ''مندر کا دیا'' عنوان سے کیا ہے۔ تیسرا ترجمہ فضل الرحمن نے کیا ہے جو سیوان سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں امرت لال عشرت اور ظہیر احمد صدیقی نے بھی مثنوی چراغِ دیر کا ترجمہ اپنے انداز میں کیا ہے۔

آئیے اب زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل غالب کی فارسی مثنوی اور اس کے پانچ اہم اردو تراجم کا تفصیل سے جائزہ لیں۔ اختر حسن نے مثنوی ''چراغ دیر'' کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ انہوں نے کیفی اعظمی کی فرمائش پر کیا تھا۔ جو وہ اپنی کسی فلم کی اسکرپٹ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اختر حسن کے ترجمہ 1974ء میں منظرِ عام پر آیا اس پر مالک رام نے ''پیش گفتار'' لکھا۔ اختر حسن کے ترجمے میں صرف 74 اشعار ہیں جبکہ اصل مثنوی میں 108 اشعار ہیں۔ انہوں نے نسبتاً بڑی بحر کا انتخاب کیا تھا۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی مثنوی میں معیار و پختگی جھلکتی ہے۔

معروف ادیب ظ۔ انصاری بطور مترجم بھی اپنی ایک مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب ''مثنویاتِ غالب: مع فارسی متن و ترجمہ'' 1983ء میں چھپی۔ اس کتاب میں غالب کی سبھی گیارہ

مثنویاں شامل تھیں۔ ظ۔انصاری نے ترجمے میں اصل متن کی صداقت برقرار رکھنے کے مقابلے میں حسنِ بیان کو ترجیح نہیں دی۔اس ضمن میں ظ۔انصاری لکھتے ہیں کہ ''آخر اردو کے سب سے بڑے شاعر کا فارسی کلام ہے، ہم کون اس میں اپنی روانیِ طبع دکھانے والے؟'' لہٰذا ان کا ترجمہ نثری ہے اس میں اصل مثنوی کے پورے 108 اشعار کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

مثنوی ''چراغِ دیر'' کا اردو ترجمہ علی سردار جعفری نے بھی کیا تھا جو کہ نثر میں تھا۔علی سردار جعفری نے اپنے ترجمے کو فارسی متن کا پابند رکھنا پسند کیا۔ یہ ترجمہ غالب کی دوسو سالہ تقریبات کے موقع پر 1997ء میں منظرِ عام پر آیا۔علی سردار جعفری نے اس کا عنوان ''غالب کا سومنات خیال'' رکھا۔مگر پروفیسر صادق تنویر احمد علوی کی کتاب ''غالب کی فارسی شاعری: تعارف و تنقید'' کے حوالے سے اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ''سردار جعفری مرحوم نے اپنے اس ترجمے کا نام 'غالب کا سومنات خیال' رکھا ہے۔ خوبصورت نام ہے۔لیکن غالب نے نہ صرف خیال کو بنیاد بنا کر یہ مثنوی نہیں لکھی۔یہ تو 'حال' کے درجے میں آتی ہے کہ یہ سب غالب کا مشاہدہ ہے۔'' اس کتاب میں بھی مکمل 108 اشعار کا منثور ترجمہ ہے۔بقول علی سردار جعفری ''غالب کی یہ سرور انگیز مثنوی ایک زندہ وجاوید شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔''

1999ء میں کالیداس گپتا رضا کا ترجمہ ''مثنوی چراغ دیر'' منظرِ عام پر آیا۔انہوں نے مثنوی کے نثری ترجمے کے علاوہ 41 اشعار کے منظوم ترجمے بھی کیے ہیں جو ''چراغِ دیر میں بنارس کا بیان'' عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔یہ منظوم ترجمے صرف شہرِ بنارس سے متعلق ہیں۔منظوم ترجمے انہوں نے کسی اوپیرا کے لئے کہے تھے۔اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کالیداس گپتا رضا کے منظوم ترجمے خاص ادبی اہمیت کے حامل نہیں۔یہی بات پروفیسر صادق کے کھرے لفظوں میں یوں بیان ہوئی ہے: ''شاعری کا غیر فنکارانہ منظوم ترجمہ کیا ہوتا ہے اور شعر ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر اپنا حُسن کیسے کھوتا ہے۔کالیداس گپتا رضا کا یہ ترجمہ اس کی ایک مثال ہے۔'' اس کتاب میں متن کے ساتھ پورے 108 اشعار کا نثری ترجمہ شامل ہے۔ساتھ ہی انہوں نے اپنے دلچسپ اسلوب میں اس کا ضمیمہ بھی لکھا ہے۔علی سردار جعفری اور کالیداس گپتا رضا کے تراجم میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے جسکا تجزیہ حنیف نقوی نے اپنے مضمون بعنوان ''مثنوی چراغِ دیر'' میں کیا ہے جو ہفت روزہ ''ہماری زبان'' کے شمارے یکم دسمبر تا 8 دسمبر 1999ء میں شائع ہوا تھا۔بقول پروفیسر صادق 'حنیف نقوی نے اپنے اسی مضمون میں سردار جعفری اور کالیداس گپتا رضا کے ترجمہ شدہ اشعار میں اغلاطِ تفہیم کی نشان دہی بھی کی ہے۔''

اس پس منظر میں ان پانچوں مترجمین کی لیاقت و اہلیت کے اعتراف کے باوصف پروفیسر صادق

کے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جن کے توسط سے وہ سردار جعفری اور گپتا رضا کو اپنی بے لاگ تنقید کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔ وہ بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ''سردار جعفری نے اپنے ہمدمِ دیرینہ ظ۔ انصاری کے ترجمے کا کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ فارسی شعر و ادب سے ظ۔ انصاری کی گہری واقفیت، ترجمہ نگاری کے معاملے میں ان کی فنی مہارت اور اس میدان میں ان کی شہرت و مقبولیت کے باوجود ان کے ترجمے کو نظر انداز کر کے چراغِ دیر کے سلسلے میں کالیداس گپتا رضا سے استفادہ کرنے اور اپنی کتاب 'غالب کا سومنات خیال' کے پیش لفظ میں رضا کا شکریہ خود ادا کرنے کے بجائے کتاب کے مرتب جابر حسین کو استفادے کا ذکر کرنے کی تاکید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' اس بے لاگ تنقید کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صادق آگے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''ظ۔ انصاری اور سردار جعفری کے کیے ہوئے نثری تراجم میں کفالتِ لفظی کے ساتھ اجمال کی تفصیل پیش کر دینے کی سعیِ مسلسل ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے تراجم غالب کے فارسی متن کو پوری طرح سمجھانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔''

حنیف نقوی نے ''مثنوی چراغِ دیر'' کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے وہی بحر استعمال کی ہے جو غالب نے کی تھی۔ یہ بحر بڑی مختصر تھی۔ اس لئے حنیف نقوی کا ترجمہ پورے مفہوم کو سمیٹنے کے معاملے میں کہیں کہیں انصاف نہیں کر سکا ہے۔

اس مثنوی کے تراجم کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً دو سو سال قبل غالب کو شہرِ دہلی چھوڑ کر کلکتہ کا جو سفر اختیار کرنا پڑا وہ ان کے لئے ایک بڑا جذباتی صدمہ سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے مخلص احباب و اعزا کو خیر باد کیا اور نئے مقامات پر قیام کرتے ہوئے یہ سفر طے کیا تھا۔ مثنوی میں شہرِ دہلی سے ان کی گہری وابستگی ہی کا اظہار نہیں بلکہ بنارس جیسے اہلِ ہنود کے مقدس مقام کی عظمت اور اہلِ بنارس کی روحانی بلند آہنگی، وہاں کے مرد و زن کے رہن سہن، عادات و اطوار، چال ڈھال اور نشست و برخاست الغرض وہاں کے جملہ ثقافتی پس منظر و تہذیبی منظر نامے کو انہوں نے اس مثنوی میں اپنے تخیل کی پرواز اور اظہار کی بلاغت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہاں ہم پروفیسر صادق کی اس مرتبہ کتاب سے بنارس سے متعلق چند اشعار کو پیش کرتے ہیں تاکہ قاری اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ غالب نے اس مثنوی میں اپنے فن کے کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں۔

تعالی اللہ بنارس چشم بدور بہشت خرم و فردوسِ معمور غالب

اردو تراجم:

سبحان اللہ بنارس کو خدا نظرِ بد سے بچائے، یہ ایک مبارک جنت ہے۔ یہ بھرا پُرا فردوس ہے ظ۔ انصاری

کرے شرمندہ جنت کو بھی اپنے کیفِ رنگیں سے بنارس کو خدا محفوظ رکھے چشمِ بد بیں سے اختر حسن

سبحان اللہ! چشمِ بد دور، بنارس مسرتوں کی جنت اور بہشت کا شباب ہے (بھرا پُرا فردوس) سردار جعفری

بنارس نام اس کا چشم بددور بہشتِ خرم و فردوسِ معمور حنیف نقوی
سبحان اللہ! چشمِ بددور! بنارس خوشیوں کی جنت اور بھراپُرا فردوس ہے کالیداس گپتا رضا
بنارس را کسے گفتا کہ چین است ہنوز از گنگ چینش بر جبین است غالب

اردو تراجم:

کسی نے کہہ دیا کہ بنارس (حسن میں) چین کے مثل ہے۔ (یہ تشبیہ بنارس کو ایسی ناگوار گزری کہ) آج تک گنگا کی موج اس کے ماتھے کا بل بنی ہوئی ہے۔ (ظ۔انصاری)

بنارس کو کسی نے چین سے تشبیہ دے دی تھی ابھی تک اس کے ماتھے پر شکن ہے بصورتِ گنگا کی اختر حسن

کسی نے حسن کی تعریف میں بنارس کو چین کہہ دیا۔ (یہ سن کر بنارس کو اپنی توہین محسوس ہوئی اور اسی لئے) اب تک بہتی ہوئی گنگا کی شکل میں اس کے ماتھے پر شکن ہے۔ (سردار جعفری)

کسی نے چین اس کو کہہ دیا تھا تبھی سے چینِ پیشانی ہے گنگا حنیف نقوی

کسی نے تعریف کرتے ہوئے (حسن کی برابری میں) بنارس کو چین کہہ دیا۔ (اس میں بنارس کو اتنی توہین معلوم ہوئی کہ) اب تک (دھار کی صورت میں) گنگا کی پیشانی پر شکن ہے۔ (چین سے مراد نگارخانہ چین ہے) (کالیداس گپتا رضا)

غالب اپنے اندازِ بیان میں یکتا و یگانہ تھے۔ مترجمین نے غالب کی اس فارسی مثنوی کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی بڑی مخلصانہ سعی کی ہے۔ غالب کے خیالات وتصورات کو نثری تراجم میں بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکا ہے لیکن منظوم ترجموں میں مخصوص بحر و وزن کی پابندی کے باعث مترجمین اکثر جگہ متن کے ساتھ مکمل طور پر ایمان داری کا رویہ اختیار نہیں کر سکے اور اس طرح کہیں کہیں اصل متن کے ساتھ ترمیم و اضافے کے مرتکب بھی ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح اس مثنوی کا وجود دورانِ سفر ہوا تھا، پروفیسر صادق کی زیرِ تبصرہ کتاب ''مثنوی چراغِ دیر مع پانچ اردو تراجم'' کی ترتیب و تدوین بھی ان کے بھوٹان کے سفر کے دوران عمل پذیر ہوئی۔ جس کا تفصیلی بیان بھی انہوں نے اپنے تعارفی مضمون میں بڑے پُرکشش لب و لہجے میں کیا ہے۔ پروفیسر صادق اپنے بے لاگ تجزیے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ زیرِ نظر پانچوں تراجم اس لحاظ سے بہتر اور قابلِ قدر ہیں کہ تمام مترجمین نے اپنے طور پر غالب کے اشعار کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

❁❁❁

غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

17 ستمبر 2016 کو حکیم عبدالحمید مرحوم کے 108 ویں یوم ولادت کے موقع پر خصوصی لیکچر:

غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی، نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں حکیم عبدالحمید مرحوم کے 108 ویں یوم ولادت کے موقع پر، حکیم عبدالحمید کی یاد میں ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر معروف نقاد وادیب اور غالب اکیڈمی کے صدر پر شمیم حنفی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ادارے قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور اس کو بگاڑنا بہت آسان ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے جامعہ ہمدرد یونیورسٹی، اسکول اور دیگر ادارے قائم کئے ہیں اور غالب اکیڈمی بھی انھیں کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ حکیم صاحب کی خدمات کو بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکیم عبدالحمید نے ہمارے ملئے ایک روایت چھوڑی ہے۔ اس کو آگے بڑھانا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سابق ڈائریکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ نے اپنے خصوصی لیکچر میں کہا کہ ہمیں تینوں رہنما حکیم عبدالحمید، ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی، شفیع قریشی وغیرہ بہت یاد آرہے ہیں۔ انھوں نے حکیم عبدالحمید کا قول پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی شخص کسی کے لئے کارآمد ہیں تو انھیں چاہیے کہ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور تعیش پسندی سے دور رہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکیم عبدالحمید نے قوم وملت کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے پوری زندگی جدوجہد کی۔ جامعہ ہمدرد اور ان کے قائم کردہ دیگر ادارے اس کی روشن مثال ہے۔ اس سے بے شمار تشنگان علم فیض یاب ہورہے ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مزید کہا کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پر انتھک کوشش کی۔ ہندو مسلم نفرت کو کم کرنے میں زندگی بھر لگے رہے۔ برصغیر کے فیڈریشن بنانے پر زور دے رہے تھے۔ حکیم صاحب نے اپنی پوری توجہ تعلیم برائے روزگار پر مرکوز کی اور اپنی زندگی میں یونیورسٹی قائم کی۔

آخری غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کیا اور کہا کہ حکیم صاحب کی اپنی فکر تھی تعلیم پر انھوں نے جو کام کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ حکیم صاحب نے ہندوستانی کو سارک ممالک کی زبان کے لیے کوشاں تھے۔

5/ستمبر 2016 کو غالب اکیڈمی میں مشہور افسانہ نگار جوگندر پال کے یوم پیدائش پر جلسہ:

5/ستمبر 2016 کو غالب اکیڈمی میں اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار جناب جوگندر پال کے انتقال کے بعد پہلے یوم پیدائش کے موقع پر ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ترنم ریاض نے فرمائی۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی، خورشید اکرم، انجم عثمانی، نگار عظیم اور سکریتا پال نے جوگندر پال کی زندگی پر اظہار خیال کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ بڑے فکشن نگار کے ساتھ مضمون نگار بھی تھے۔ انھوں نے نادید جیسے ناول اور کھودو بابا کا مقبرہ جیسا افسانہ لکھا تو بہت سے مضامین بھی تحریر کیے۔ علی گڑھ میں ایک فکشن کے سیمینار میں جوگندر پال نے افسانے کے فن پر مضمون پڑھا تھا جس پر لوگوں نے خوب داد دی تھی۔ وہ شرافت کا سرچشمہ تھے کسی کو نقصان پہنچانا ان کی فطرت میں نہیں تھا۔ وہ عجیب و غریب آدمی تھے ان کے قاری بے شمار تھے ان کی شخصیت جادوئی تھی۔ ان کی شفقت سب پر حاوی تھی۔ شروع کی کہانیوں میں حقیقت پسندی ہے بعد میں ابہام آیا وہ تجربے کرنے سے ڈرتے نہیں تھے۔ پڑھنے سے زیادہ سوچتے تھے۔

خورشید اکرم نے کہا کہ جوگندر پال نے اردو ادب کے لیے اپنے آپ کو قربان کیا۔ اپنی آسائش چھوڑ کر ادب لکھنا بڑی بات ہے۔ معاصر نسل میں ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔ جلسے میں اتنی عمدہ باتیں کرتے تھے جو حیران کن ہوتی تھیں۔ ان کے اندر جو کچھ تھا وہ تخلیقات میں نہیں آئی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی گہرائی اور گیرائی تھی چھوٹوں سے محبت کرتے تھے۔ اس موقع پر انجم عثمانی نے کہا کہ ان کا کہنا تھا کہ ''کہانی میں ڈوب جاؤ''۔ وہ خود بھی لکھتے تھے تو اپنے کرداروں میں ڈوب جاتے تھے۔ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ میں نے جوگندر پال صاحب کو کہانیوں کے کردار سے الگ نہیں دیکھا وہ رنگ روپ بدل لیتے تھے کبھی بچہ بن کے تو کبھی میلہ دیکھتے ہوئے وہ کوئی نہ کوئی کہانی بیان کر جاتے تھے۔ وہ دعا دیتے تھے تو بالکل مختلف انداز میں ایک بار کہنے لگے تمہاری کہانی میں لطف نہیں آیا ابھی تم دکھ اور جھیلو۔

ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکیڈمی سے جوگندر پال کی وابستگی بہت پرانی ہے وہ تادم حیات غالب اکیڈمی آتے رہے۔ وہ ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نگار تو تھے ہی وہ ایک اچھے انسان تھے۔ نئی نسل اور اردو کے تعلق سے فکر مند تھے غالب اکیڈمی میں ماہنامہ ادبی نشستوں کا آغاز کرایا اس میں بعض مرتبہ وہ خود تشریف لاتے اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرتے اور اپنی کہانی سیالکوٹ سے انبالہ دہلی کینیا اور اورنگ آباد کی کہانی بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے۔ ڈاکٹر سکریتا پال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پاپا نے اردو میں جو کچھ لکھا اسے ہندی میں بھی منتقل کیا گیا

نادیدکا ترجمہ انگریزی میں ہوگیں۔ مختلف زبانوں میں ان کی کہانیوں کے ترجمے ہوئے ہیں اور انگریزی میں انھوں نے بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ ان کی تخلیقات کو یکجا کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے پانچ آنیپوری لکھی ہیں اور پانچ شہروں کا ذکر کیا ہے جس میں سیالکوٹ، انبالہ، دہلی، کینیا اور اورنگ آباد ہیں اسی لیے انتقال کے بعد ان کی راکھ کو پانچ شہروں میں پہنچایا گیا۔

ڈاکٹر ترنم ریاض نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ پال صاحب بڑے فکشن نگار تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا کہ قلم کی عظمت کے لیے ایوارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت اعزازات وانعامات سے بڑی تھی۔ وہ بہت نیک۔ مشورے دیا کرتے تھے شفقت ومحبت کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر شاداب تبسم نے کہا کہ میری پال صاحب سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ان کی کہانیاں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم انھیں جانتے ہیں۔ آخر میں سکریٹری عقیل احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

9/اکتوبر 2016 کو غالب اکیڈمی میں ''اردو صحافت کا سفر اور جی ڈی چندن کی صحافتی خدمات '' کے عنوان سے یک روزہ نیشنل سمینار:

معروف صحافی آنجہانی جی ڈی چندن کے 94 ویں یوم پیدائش کے موقع پر غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ''اردو صحافت کا سفر اور جی ڈی چندن کی صحافتی خدمات'' کے عنوان سے 9 اکتوبر 2016 بروز اتوار کو'' یک روزہ نیشنل سمینار'' منعقد کیا گیا۔

سیمینار کے افتتاحی پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے بزرگ صحافی کلدیپ نیر نے کہا کہ جب تک کسی زبان کو روزی روٹی سے نہیں جوڑیں گے اُس وقت تک اس زبان کا فروغ ناممکن ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کو روزی روٹی سے وابستہ کیا جائے۔

چندن صاحب کے صاحبزادے انل کمار لکھین ریٹائرڈ آئی اے ایس نے استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ میرے والد محترم جی ڈی چندن اردو صحافت سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے بلکہ یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ انہوں نے اردو صحافت کو اپنے لئے حرز جاں بنالیا تھا۔ گو انہوں نے لاہور سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی لیکن ان کی ساری زندگی اردو صحافت کی خدمات میں ہی گذری۔ وہ تقریباً تین دہائیوں تک حکومت ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات کے (پی آئی بی) کے شعبہ اردو کے سربراہ رہے۔ چندن صاحب کی جو دلی خواہش تھی کہ اردو صحافت کے متعلق مشن کو اپنی زندگی میں ہی پورا کرلیں لیکن زندگی نے وفا نہ کی، مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ میں نے ان کی زندگی میں اردو نہیں سیکھی مگر

اردو صحافت کے احیاء کے ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑوں گا۔

شاہد صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چندن صاحب ایک تحریک تھے اور مجھے امید ہے کہ اب ان کے صاحبزادے انل کمار لکھینا اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان کبھی بادشاہوں کی زبان نہیں رہی بلکہ عام لوگوں کی زبان رہی ہے۔ شاہد صدیقی نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہا کہ اردو صحافت ختم ہوگئی لیکن میں کہتا ہوں کہ اردو صحافت ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے جدید ٹکنالوجی اور نئے وسائل سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ چندن صاحب کی کوششوں سے یواین آئی میں ٹیلی پرنٹر کا آغاز ہوا۔ راشٹریہ سہارا کے گروپ ہیڈ سید فیصل علی نے کہا کہ جی ڈی چندن صاحب بہت بڑے صحافی تھے۔ انہوں نے کہا کہ میری سوچ اور میری فکر یہ ہے کہ اردو کو نئی نسل اور نوجوانوں تک پہونچایا جائے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ آج کے سیمینار کا تعلق صحافت کے ماضی، حال اور مستقبل سے ہے۔ چندن جی کے صاحبزادہ لکھینا جی نے جس اخلاص سے سیمینار منعقد کیا ہے یہ قابل تعریف ہے۔ خدا ہر شخص کو ایسا ہی ہونہار اور لائق مند بیٹا عنایت کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ چندن صاحب کا اردو سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ اردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ غیر مسلموں کی خدمات کو الگ کرکے نہیں رکھا جاسکتا۔

جناب ایس ایم خان (ڈائریکٹر آر این آئی) نے دوسرے اجلاس میں اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ پی آئی بی سے میں نے اپنی سروسز کی شروعات کی تھی لیکن اس وقت چندن صاحب ریٹائر ہوچکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بہت سے اخبارات اور رسائل آر این آئی میں رجسٹرڈ ہیں لیکن کافی عرصہ سے وہ بند ہیں یا اس کے مالک وفات پاچکے ہیں یا اس کو چلانے کے لئے دل چسپی نہیں رکھتے ہیں۔ اس پر ایک مہم چلانے کی ضرورت ہے اور ایسے اخبارات کو از سر نو جاری کیا جائے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو صحافت زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔

اس موقع پر نند کشور وکرم، ندیم صدیقی، نریش ندیم، ڈاکٹر فرحت رضوی، سہیل انجم، ریاض قدوائی، پروفیسر شافع قدوائی، معصوم مرادآبادی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری،، انجم عثمانی نے مقالہ پیش کیا۔ آخر میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری عقیل احمد نے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔

نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب اور وسیم راشد نے انجام دیئے۔

❁❁❁
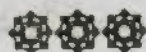
مطبوعات غالب اکیڈمی

نام کتاب	مصنف/مترجم	قیمت
دیوانِ غالب (ہندی)	غالب اکیڈمی	100/-
دیوانِ غالب عام ایڈیشن	غالب اکیڈمی	100/-
یادگار غالب فارسی متن کے ترجمے کے ساتھ	الطاف حسین حالی	450/-
دیوان غالب ڈیلکس	غالب اکیڈمی	200/-
شرح دیوان غالب اردو	قاضی سعید الدین علیگ	300/-
غالب اور ہند مغل جمالیات	شکیل الرحمن	350/-
تفتہ اور غالب	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	35/-
شرح دیوان غالب (ہندی)	نسیم احمد عباسی	550/-
غالب اور فن تنقید	اخلاق حسین عارف	25/-
تصورات غالب	محمد عزیز حسن	35/-
انشائے مومن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	25/-
مومن شخصیت اور فن	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	300/-
ہندوستانی رنگ	پروفیسر محمد حسن	75/-
نوائے سروش (انگریزی)	غالب اکیڈمی	40/-
اقبال/مضامین مقالات	پروفیسر اسلوب احمد انصاری	95/-
جنوب مغرب ایشیا میں رابطے کی زبان	پروفیسر محمد حسن	75/-
رقص شرر	انّ میری شمل (قاضی افضال حسین)	90/-
غالب اور آہنگ غالب	یوسف حسین خاں	350/-
تلمیحات غالب	محمود نیازی	90/-
جہات غالب	ڈاکٹر عقیل احمد	200/-
حکیم عبدالحمید شخصیت اور خدمات	ڈاکٹر عقیل احمد	150/-
مطالعات خطوط غالب	حکیم عبدالحمید	150/-
مطالعات کلام غالب	حکیم عبدالحمید	600/-
نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	150/-
اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ	پروفیسر شمیم حنفی	150/-
مزار غالب (اردو)	شمس بدایونی	100/-
مزار غالب (ہندی)	شمس بدایونی	100/-
غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات	یوسف حسین خاں	200/-
غالب اور منٹو	شمس الحق عثمانی	160/-